PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

تم بڑی سنگدل ہو!

طبعزاد افسانوں کا مجموعہ

مصنفہ

عزیز النساء

بی۔ ایس۔ سی۔ عثمانیہ

رضا علی فاضل فینسی مارٹ عابد شاپ حیدرآباد دکن

ع ۰ جملہ (فنسی) بارٹ عابد شاپ

طبع اول ـــــــــــــــ ایک ہزار

~~ستمبر ۱۹۴۸ء~~ اپریل ۱۹۴۹ء



مطبوعہ

جمہور پرنٹنگ پریس

عابد روڈ حیدرآباد دکن

عیب جو نظروں سے دور اندھیرے میں اپنے محبوب کے سینے میں
منہ چھپائے گلے شکوے کر رہی ہے۔ روٹھ رہی ہے۔ من رہی ہے
اور پھر اپنی تشنہ کامی پر اپنے آبدار موتی جیسے آنسو بہا رہی ہے
عزیز النساء کی ہر کہانی گویا ایک رومانی راز ہے کسی گرفتار
محبت دوشیزہ کے ننھے منے دل کا سہانا راز —— جو پرانی
چار دیواریوں میں قید ہے جہاں اس کے اطراف ماں باپ
بھائی بہن، عزیز و اقارب، دوست ہمسائے سبھی ہیں ان سب کے
درمیان گھرے رہنے کے باوجود وہ کسی اور کے ساتھ رہتی ہے
اس کے ساتھ جو سب کی نظروں سے پنہاں ہے مگر سدا اس کی
خوبصورت آنکھوں کے آگے مسکراتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن ہے
اس کے خوابوں کا بادشاہ ہے۔ لیکن عزیز کا خیال ہے اس
دیس میں لڑکی —— ایک واحد شخصیت کا نام نہیں۔ یہاں
دوہری زندگی گزارتی ہے۔ دو شخصیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔

ایک لڑکی وہ جو دل ہے ——

ایک لڑکی وہ جو جسم ہے ——

لڑکی کا دل اور لڑکی کا جسم دونوں ہمیشہ مخالف سمتوں کے
مسافر رہے۔ جسم کبھی دل کے ساتھ نہیں [illegible] دونوں کو

کھو کر لٹی ہاری روتی ہے اور اس کی زندگی آنسوؤں میں بھیگنے لگتی ہے ——— !

عزیز النسا، نے اپنی کہانیوں میں ہندوستانی لڑکی کی اپنی دو الگ الگ شخصیتوں کے تجزیئے بڑے فنکارانہ انداز میں کئے ہیں۔ اس کی ہر کہانی میں ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں کہ ——— رضیہ ہے تو ایک ہی لڑکی مگر اس کا دل رضا کے پاس ہے اور جسم بہزاد کے پاس ——— (افسانہ :- یہ دنیا ہے)

عزیز کو اپنی تشنہ کام ہیروئن کا اس طرح چوری چھپے چپکے چپکے تکیہ میں منہ چھپا کر رونا پسند نہیں ۔عزیز النسا ایک باغی لڑکی ہے ۔ایک اجتہادی افسانہ نگار لڑکی۔ وہ اپنی ہیروئن کے آنسو چن چن کر جمع کرتی ہے اور اپنے افسانوں میں بکھیر دیتی ہے اور پھر مجسم طنز بن کر ان آنسوؤں کی نگرانی کرتی ہے کہ کہیں کوئی ظالم باپ یا لاکھوں کروڑوں کی دولت رکھنے والا سیٹھ خدا بخش دستم کا شوہر ایک موتی نہ اٹھا سکے ——— نہ چرا سکے ———!!

پردۂ شب میں گھٹ گھٹ کر رونے والیوں کیلئے عزیز النساء کی ہر کہانی پیام خندۂ صبح عشرت ہے ۔

عزیز النسا کے افسانوں میں ہمیں دھوم دھام کی شادیوں کی

جگمگاہٹ اور باجوں، ڈھولوں، تاشوں اور نفیریوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ مگر عزیز کا خیال ہے جیسے ہی یہ شور کم ہوتا ہے شادی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ عزیز النساء کی نظر میں شادی بجلی کے قمقموں کی جگمگاہٹ اور نفیریوں کے سوائے اور کچھ بھی نہیں —— ایسی شادی پر عزیز بڑا تیز طنز کرتی ہے کہ

"بہزاد اور رضیہ اس طرح زندگی کے دن گزار رہے تھے
جیسے کسی سرائے میں دو مسافروں کا ساتھ ہو جائے۔"

عزیز ایسی شادی کو "عورت کی موت" کہتی ہے جس طرح ملک میں ایک عورت دو زندگیاں گزارنے پر مجبور ہے اسی طرح وہ دو بار مرتی ہے ایک بار اپنی شادی پھر —— دوسری بار —— اپنی طبعی موت پر —— عزیز النساء کے اکثر افسانوں میں ہمیں ایک عورت کی دو زندگیاں اور ان دو زندگیوں کی تلخیاں اور اس کے بعد اس کی دو اموات کے سانچے ایسے بھیانک طور پر نظر آتے ہیں کہ مرد کا بنایا ہوا سماج دونوں ہاتھوں میں اپنا مکروہ چہرہ چھپا لینے پر مجبور ہے۔

عزیز النساء کو عورت کی اس توہین اور اس کے ساتھ اس ناانصافی کا بڑا غم و غصہ ہے کہ سماج کی نظر میں عورت ایک

قابل خرید و فروخت جنس ہے۔ اس سماج نے عورت کو انسان کبھی نہ سمجھا بلکہ طلائی انگوٹھی، ریشمی ساڑی اور زمردیں جھومر کی طرح چمکیلی اور قیمتی شئے سمجھا اور اس کی خرید و فروخت شروع کر دی، طلائی انگوٹھیوں، ریشمی ساڑیوں اور زمردیں جھوموں کی طرح!!!

عزیزہ سماج کی اس ناانصافی پر شدت سے احتجاج کرتی ہے اس کا مطالبہ ہے کہ عورت کو عورت سمجھا جائے۔ عورت جنس نہیں ہے عورت انسان ہے۔ عورت نہ بیچی جاتی ہے اور نہ خریدی جا سکتی ہے

عزیز النساء کا یہ دعوے ہے کہ عورت کو آج تک خریدا نہ جا سکا۔ عورت اتنی انمول اور لاقیمت ہستی ہے کہ اسے کبھی بھی دنیا کی ساری دولت کے عوض بھی خریدا نہیں جا سکتا ——— عورت تو صرف "اپنائی" جا سکتی ہے ——— چنانچہ ان کہانیوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہزاد نے رضیہ کو، رضا نے کلثوم کو، سیٹھ خدا بخش نے شہلا کو، ڈاکٹر شیرازی نے لیڈی مخمور کو، اور شمیم نے شاہدہ کو بظاہر تو خرید لیا ہے لیکن ان خریداروں کو سودے بازی کے بعد اچانک یہ محسوس ہوا کہ وہ ——— وہ چیز تو خرید نہ سکے جس کے لئے انہوں نے اپنا روپیہ لگایا تھا۔

اس بدنصیب ملک میں عورت کے جسم کی قیمت گنتی کے

چند روپے بھی ہے اور روٹی کے چند ٹکڑے بھی ــــــ مگر مرد عورت سے شادی صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس کو صرف عورت کا جسم نہ ملے بلکہ عورت بھی ملے۔ ادھوری عورت نہیں۔ بغیر دل کی عورت نہیں۔ ویران پہلو والی عورت نہیں ــــــ بلکہ مکمل عورت پوری عورت۔

عزیز النساء کہتی ہے کہ جب تک عورت کو چاندی سونے کی ترازو میں تولا جائے گا۔ اور جب تک محبت کی ترازو کے پلڑوں میں یا عورت کا دل اور مرد کا دل برابر نہ تولا جائے گا۔ اس وقت تک مرد صرف ریشمی ساڑی خریدتا رہے گا۔ عورت نہیں خرید سکیگا۔

عزیز النساء ان کہانیوں میں ہمیں جو اصلی عورت نظر آتی ہے وہ عورت شاید اس سچ مچ کی دنیا میں ابھی داخل ہی نہیں ہوئی۔ عزیز اس اصلی عورت کو اس سماج میں گھسیٹ لانا چاہتی ہے تا کہ سماج دیکھے ــــــ اس اصلی عورت کے حسن و جمال رعب اور وقار کو دیکھے اور پھر شرم سے سر نہ اٹھا سکے۔ اور مجرم ضمیر سمیت اسکے قدموں میں گر پڑے کہ ــــــ مجھے معاف کر دو عزیز النساء کو یقین ہے کہ جس دن اس کی کہانیوں کی اصلی عورت اپنے قدموں سے زمین کو سونا بناتی آئے گی۔ جب اس کے چہرے کا

چاند اس دنیا میں طلوع ہوگا۔ جب اس کی زلفوں کی خوشبوئیں ہوا کے جھونکوں میں بدل جائیں گی۔ اس دن اس دنیا میں وہ مرد دم توڑ دے گا جو عورت کا خریدار ہے اور وہ مرد پیدا ہوگا جو عورت کا ساتھی ہے۔ عورت کا محبوب ہے۔

عورت اور مرد کی شادی ـــــ عزیز اس لفظ شادی پر بڑے طنزیہ انداز میں مسکراتی ہے اور کہتی ہے
یہ۔ یہ شادی نہیں ہے۔ عورت کا نیلام۔ ایک ہاتھ پاؤں جکڑی ہوئی، ہونٹوں کا بخیہ کی ہوئی۔ آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی ایک بے جان عورت کا نیلام ـــــ ایک سرخ گٹھڑی کا نیلام جس کے سامنے قاضی ایجاب وقبول کی تین بولیاں لگاتا ہے اور پھر وہ عورت بالکل اسی طرح نیلام کر دی جاتی ہے جس طرح کرسی، الماری یا پلنگ ـــــ ایسی عورت اور ایک بے جان پلنگ میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ عزیز یہاں کھڑے ہوکر بڑے عجیب انداز میں بد طینت سماج کو سمجھانا چاہتی ہے کہ عورت پلنگ نہیں ہے۔ عورت تو زمین کا دل ہے۔

عزیز النساء نے اپنے ہر افسانے میں اس حقیقت کو آزما دکھا ہے جس دن مرد نے عورت کو ایک ریشمی ساڑی یا پلنگ سمجھا

اسی دن عورت مرد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتی ہے یہی
وجہ ہے کہ عزیز کا ہر افسانہ مجھے ایک "فراقیہ" نظر آتا ہے جس پر
رومانوی فسردگی کی فضا چھائی ہوئی ہے رضیہ بہزاد سے
ملی اور جدا ہو گئی۔ مہرو احمد سے بچھڑ گئی۔ سمینہ اور انجم کے درمیان
ہجر کی کالی رات پھیل گئی۔

بعض بعض جگہ عزیز النساء جیسی مجھے ایک بہت بے درد
سنگدل فن کار نظر آتی ہے اپنے ہر افسانے میں وہ محبت بھرے
دلوں اور جسموں کی جدائی کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر بڑے قہر آلود
بڑے زہرناک لہجے میں ظالم سماج سے پوچھتی ہے۔

"اب بولو کیا کرو گے ؟"

پھر وہ زبردستی سماج کی بانہہ پکڑ کر اپنی روبینہ، سمینہ، شاہد
اور مہرو کے قریب لاتی ہے اور تشنہ کام کنواریوں کے زرق
برق رنگ برنگے گھونگٹ بڑی بے رحمی سے الٹ کر سماج سے
پوچھتی ہے۔

"پہچانتے ہو ان مرجھائے ہوئے گلالوں کو۔"

"ان ادھ کھلی کلیوں کو ؟"

"ان بھیگتی پلکوں کو ؟"

سماج کے پاس اس کا کیا جواب ہے ـــــ؟ سماج عزیز کے کچوکے لگانے والے قلم کے آگے لاجواب ہے۔ خوف زدہ نظروں سے عزیز النساء کو مڑ مڑ کر گھور رہا ہے۔

. . . .

عزیز النساء جیبی رومانوی کہانیاں لکھتی ہے مگر زندگی کے رومانوی پہلو کے بارے میں بڑا ترقی پسند نقطہ نظر رکھتی ہے وہ سماج کے اس کہنہ فرسودہ اور شر انگیز نظریہ کو جو دل کو جسم سے الگ کر دینے کا عادی رہا ہے، ہلاک کر دینا چاہتی ہے۔ عزیز کے پاس جسم بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ جیتے جاگتے، گرم گوشت اور سُرخ لہو رکھنے والے جسموں کی محبت کو خالص انسانی محبت سمجھتی ہے۔ اس کے افسانوں کے پس منظر میں نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے باوجود یہ پوچھتی نظر آتی ہے کہ

کیوں ـــــ آخر کیوں ہم اپنے محبوب کا جسم حاصل نہ کریں

کیا یہ حیاتیاتی حقیقت نہیں کہ عورت مرد کے لئے یا مرد عورت کے لئے ناگزیر ہستی ہے

!

عزیز النساء جیبی جامعہ عثمانیہ کی سائینس گریجویٹ ہے۔ وہ

یکے بعد دیگرے پڑھنی شروع کیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے عزیز
مجھ سے نذاق کر رہی ہے ——— کیا یہ نذاق نہیں ہے کہ ہر افسانے
میں مرد کی نفسانی دہشت کے منہ پر زوردار طمانچے لگا کر پھر
ایک مرد ہی سے خواہش کر رہی ہے کہ وہ اس کا مقدمہ یا دیباچہ
لکھے ——— ! اور یہ بھی تو دیکھئے کہ از ابتدا تا انتہا ایک
نرم و نازک لڑکی کے ٹوٹے ہوئے دل اور پیاسے جسم کو
نگاہوں کے عین سامنے کھڑا کر کے وہ مجھ سے آپ
کسی اور مرد سے مخاطب ہونے کے بجائے۔ ایک مرد حسن کی
زبان مستعار لیکر ایک مظلوم دوشیزہ سے کہتی ہے کہ
"تم بڑی سنگدل ہو!"
یہ جملہ سنکر اب میں اس طنز کی چوٹ کو سہا کر پھول یا
دیباچہ لکھوں ——— ؟

. . . .

عزیز النساء کی کہانیوں میں سمینہ کے شرمائے ہوئے گال،
رضیہ کے رنگ برنگے دوپٹے۔ شہلا کے چمکدار آنسو، شاہدہ کے
حقیقی ہونٹ، رومانہ کی زلفوں کا چمکیلا اندھیرا، نسترن،
نرگس جوہی گلاب اور چمبیلی کے پھول ایسے ایسے نظر فریب

رنگ بھر دیتے ہیں کہ اس کے افسانے افسانے نہیں بلکہ قوس قزحی جزیرے (Rainbow Islands) نظر آتے ہیں۔

ہاں عزیز کے افسانے بلاشبہ رین بو آئی لینڈس ہیں جہاں نرم و نازک خوبصورت لڑکیاں دھیرے دھیرے دبلے دبلے پاؤں اپنے اپنے محبوب سے ملنے آتی ہیں۔ نقرئی قہقہوں سے فضا میں موسیقی بکھیر دیتی ہیں۔ اور پھر ان فسوں پرور جزیروں سے رخصت ہوتے وقت اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہیں اور پھر چھم چھم چھم —— پھر خواب ٹوٹ جاتا ہے پھر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ عزیز النساء الفاظ نہیں لکھتی بلکہ چمکدار موتی رولتی ہے۔

اب میں آپ کی آنکھوں میں رخشندگی سمونے کے لئے اس کی پروئی ہوئی چند لڑیاں یہاں رکھتا ہوں۔ آپ خود ہی فیصلہ کرلیں کہ ایسی چمکیلی تشبیہیں اور جگمگاتے استعارے تخلیق کرنے میں عزیز کو کتنا بڑا کمال حاصل ہے۔

ایک کہانی "مثلث" میں جاتے ہوئے بچپن اور آتی ہوئی جوانی کو کس لاجواب انداز میں ظاہر کرتی ہے کہ۔

"ہمارے بچپن پر جوانی کی مہین سی چادر چڑھ رہی تھی، شباب ایسے آرہا تھا جیسے خوفزدہ چور دھیرے دھیرے دبے دبے قدموں سے کسی بیش بہا خزانے کی طرف بڑھ رہا ہو۔"

ایک دوسری کہانی "باجی" سے ایک اور لڑی چرا کر پیش کرتا ہوں کہ

"باجی کے زرد رخساروں پر پانی کی دو لکیریں نمودار ہوئیں اور غائب ہو گئیں۔ جیسے دور کسی ریت کے میدان میں دو سراب نظر آرہے ہوں۔"

کہانی —— "تیرے بغیر میں" —— جب شاہدہ دلہن بن جاتی ہے تو وہ شاہدہ کے عروسی لباس کو دیکھ کر بڑے حسرت ناک لہجہ میں کہتی ہے

"اس سرخ عروسی لباس میں ناکام تمناؤں کا خون جذب ہو کر رہ گیا ہے۔"

ایک اور کہانی "یہ دنیا ہے" میں رضیہ جس کے لباس کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے اور آئینہ نے شاید اس سے کہہ دیا کہ وہ دلکشیوں کی بے پناہ طاقت کی مالک ہے اس کی آنکھوں میں مستی اور چہرے پر ملاحت ہے۔" اسی آئینہ کو وہ

رضیہ کے بارے میں کتنا خوبصورت فقرہ لکھتی ہے کہ
"رضیہ اس ہجوم میں ان آنکھوں کو کھوج رہی تھی جن میں وہ اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ تحلیل جانا چاہتی ہو۔"

ایک کہانی ــــ "تم" ــــ میں ناکامی کی کیفیت کو سیدھے سادھے طریقے پر بیان کرنے کے بجائے وہ ایک کھنکتی ہوئی تشبیہہ استعمال کرتی ہے کہ
"میں نے اب ایسا محسوس کیا جیسے ایک سہانی بلندی پر سے ڈھکیل دیا گیا ہوں اور ہزاروں زینوں پر سے لڑھکتا لڑھکتا ناکامیوں کی اندوہ ناکیوں میں جا پڑا ہوں۔"

کہانی ــــ "عید" ــــ میں سفر، مسافر اور منزل کی صحیح کیفیات کو بتانے کی خاطر وہ لمبے چوڑے وضاحتی جملے نہیں لکھتی بلکہ ایک چھوٹا سا جملہ بھرپور جملہ لکھ دیتی ہے اور اس چھوٹے سے جملے میں وہ سب کچھ کہہ دیتی ہے جو کوئی اور شاید دس سطروں میں بھی نہ کر سکے۔ وہ چھوٹا سا جملہ جو بجائے خود ایک کہانی ہے۔ یہ ہے۔
"وہ ایک ایسی مسافر تھی جس کی منزل خود ہی بھٹک گئی ہو۔"

. . . .

ان رنگ برنگی تشبیہوں کے علاوہ اپنی کہانی کی لڑکیوں کو بھی پیارے پیارے رنگوں میں رنگ دینے میں عزیز کو کمال حاصل ہے۔

کہانی ——"تلاش"—— میں ایک لڑکی پُر بہار پھولوں کی تلاش میں نکل آتی ہے جس کے آنگ آنگ میں مستی اور جوانی ہے —— وہ جوانی جو اپنے پائیں باغ میں ڈھیر ڈھیرے ناچتے پھولوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی۔ کلیوں کے دل ٹٹولتی، شرماتی، لجاتی، مسکراتی تھک کر حوض کے کنارے بیٹھ گئی۔ اور پھر ساون کی برستی گھٹاؤں تلے بھیگتی رہی —— ہنستی رہی اور بھیگتی رہی —— بھیگتی رہی اور اسکی چست ریشمی قمیص بھیگ کر اس کے جوان، تندرست اور خوبصورت جسم سے چمٹ گئی۔

اس منظر نگاری اور منظر میں ایسے ایسے منظر افروز رنگ بھر دینے کا عزیز النساء کو جو سلیقہ حاصل ہے وہ اردو کے چند افسانہ نگاروں کو حاصل ہے۔

اس مجموعہ کی ایک کہانی "زندگی کے کھیل" کو کہانی ماننے میں مجھے اس لئے تامل ہے کہ وہ کہانی نہیں بلکہ گل پیرہن اور

گل اندام سیمینہ کی "خلوت گاہ" ہے جہاں وہ بیٹھی اپنے ناخنوں کو پالش کر رہی ہے۔ جس کی مسہری پر نیلے رنگ کا بنا رسی پھردان پڑا ہے۔ اس پر باریک سی گوٹ لگی ہے اور بستر نیلے اطلس کا ——— مسہری کے ایک جانب ایک چھوٹی سی میز جس پر لیمپ رکھا ہے اس کے برابر ایک پتلا اور لانبا سا گلدان جس میں رات کی رانی اور شبو کی دمیدہ کلیاں رکھی ہیں۔ ایک چھوٹا سا ٹائیم پیس جس کے ہندسے ریڈیم کے ہیں۔ اس خلوت گاہ کے دروازوں پر ہلکے بنفشی رنگ کے دروازے سرسرا رہے ہیں۔ جس کے باہر چھوٹے سے بیرنگ ورانڈے میں جو پھول دار بیلوں سے منڈھا ہوا ہے۔ چنبیلی، جوہی، بوگن ویلا، موتیا اور بیلا کے پھول کنج کنج مہک رہے ہیں۔

اس افسانے میں منظر کشی اور جزئیات نگاری اتنی انتہا پر پہنچ گئی ہے کہ اس وقت تک جب تک کہ سیمینہ کی خالہ کا لڑکا حسن کمرے میں داخل نہیں ہوتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کہانی ہے یا کسی رنگین رومانوی فلم کا ایک منظر ——— اس منظر میں جب حسن ایک کہانی لئے داخل ہوتا ہے تو منظر اور کہانی کے اس حسین امتزاج پر داد دینے والا اپنی

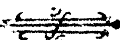
بے بضاعتی اور بے بسی پر افسوس کر کے رہ جاتا ہے
مجبوری کے وہ داد بھی نہیں دے سکتا۔

عزیز النساء کی تحریر سے میں نے آبدار موتیوں کی
یہ صرف چند لڑیاں اٹھا کر آپ کی نگاہوں کے سامنے
رکھی ہیں۔ ویسے عزیز کا ایک ایک لفظ در شہوار ہے
یہاں میں بلا جھجک ایک پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ عزیز
جیسی بہت جلد اردو افسانے کے ماتھے پر جھومر بن
لہرائے گی۔

میں مبالغے سے قطعاً کام نہیں لے رہا ہوں۔ ا
محسوسات کو من وعن بیان کر رہا ہوں کہ اردو
نگاروں میں عزیز النساء جیسی وہ نگار شیریں گفتار
اس کے جملوں کے لوچ اس کی تشبیہوں کے رس
استعاروں کی جھنکار، فقروں کی کھنک اور اس کے
لہجے کی بہار دیکھ کر ہر افسانہ نگار کے دل میں رشک و
حسد کے سانپ پھنکارنے لگتے ہیں۔ چنانچہ آج کل
میرے دل کا بھی یہی حال ہے۔ مجھے ڈر ہو رہا ہے کہ
یہ ننھی لڑکی افسانہ نگاری کے میدان ...

پیچھے چھوڑ کر آگے تو نہیں نکل جائے گی کہیں !
اب ظاہر تو سب کے سامنے میں عزیز النساء حبیبی
کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں کہ ــــــ شاباش لڑکی
ــــــ بڑھے چلی جا ــــــ تیرا سحر آگیں قلم یونہی
جادو جگاتا رہے ــــــ !
مگر سچ پوچھئے تو میری ایک شدید تمنا یہ ہے کہ میں
عزیز النساء حبیبی کا یہ جادو نگار قلم چپکے سے چرا لوں ـ !

ابراہیم جلیس



یہ کون آگیا رُخِ خنداں لئے ہوئے
عارض پہ رنگ و نُور کا طوفاں لئے ہوئے
آنکھوں سے ایک رَوسی نکلتی ہوئی ہر آں
غرقابیٔ حیات کا ساماں لئے ہوئے

سنہری آنکھیں

از گلزار

اور جب گرما کی چھٹیوں کے بعد کالج کھلا تو ایک عجیب
ترچھایا ہوا تھا۔ ہر طرف لڑکیوں کے گروہ متحیر نظروں سے
پس میں سرگوشیاں کرتے نظر آ رہے تھے۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا
ھا کہ جب دو ماہ کی طویل چھٹیاں گذارنے کے بعد لڑکیاں کالج
تیں تو اُن کے جواں چہروں پر ایک عجیب قسم کی تازگی اور شگفتگی
ہوتی۔ اُن کے تازہ چہرے اور بھرے بھرے سڈول جسم دیکھ کر
دڑھی اُستانیاں جل ہی تو جاتیں۔ لڑکیاں نئی نئی وضع کے
باس پہن کر آتیں جنہیں وہ گرمی کی دھوپ سے بچنے کی خاطر
پنے مکانوں کے تاریک کمروں میں بیٹھ کر سیتی رہی تھیں۔ وہ
ی محنت سے چُن کر طرح طرح کی تراشیں کاٹ کر اپنے سارے
وسات کو بہترین نمونے پر تیار کر کے پہنتیں تاکہ جس کسی کی نظر پڑے

اس کے سینے پر رشک و حسد کے سانپ لوٹ جائیں۔

مگر ——— ایک سال ایسا بھی آیا کہ نہ وہ کپڑوں کی بہار ہی تھی اور نہ اُن کے چہروں کا نکھار ہی تھا۔ سب کی سب، بجھی بجھی، اُداس، اُداس سی نظر آ رہی تھیں۔ اُن کی نگاہوں میں ایک عجیب سا تجسس رقصاں تھا اور زبان پر جیسے تالے لگے ہوئے تھے۔ وہ غیر معمولی طور سے حیران و پریشاں نظر آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ، دبے دبے الفاظ میں کچھ کہنے کی کوشش کرتیں لیکن پھر مردہ سی ہو کر چپ ہو جاتیں، جیسے سوچ لیا گیا ہو کہ ——— اُونہہ! ہٹاؤ بھی ——— اب کہاں تک کہتے جائیں؟ غم جاناں کی فکر کیا کچھ کم ہے جو غم دوراں میں مبتلا نظر آئیں؟"

مولسری کے گھنے درخت کے نیچے حوض کی منڈیر پر مختلف گروپ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اُداس، اُداس سے، جیسے کوئی بہت بری خبر سنکر بیٹھے ہوں۔ یکایک سب کے سب چونک سے پڑے۔ اُن کی نظریں اُس طرف اُٹھ گئیں، جدھر مدن مست کے قطار دار درخت تھے۔ سب کی نظروں سے ایک خاص قسم کی کیفیت ٹپکتی تھی۔ میں نے بھی اُدھر دیکھا جدھر سب کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک سیم تن خوبصورت سی لڑکی نہایت سادہ لباس

میں دو تین رنگین جلد کی کتابیں ہاتھ میں لئے چلی آ رہی تھی۔ لڑکی کچھ مرعوب سی اور شرمائی لجائی سی تھی جیسے اُسے اپنی اہم شخصیت کا احساس ہو رہا ہو، جیسے اُسے اس بات کا احساس ہو کہ سب کی نظریں اُس پر ہیں اور یہ کہ کئی جوان آنکھیں اس کے نازک سے حسین خدوخال کا دلچسپی و حیرت سے جائزہ لے رہی ہوں۔!!

"بھئی بات کیا ہے؟ یہ ہے کون جس کی جانب سے تم سب اس قدر حیرت سے دیکھ رہی ہو!" میں نے ذکیہ سے پوچھا۔

ذکیہ نے میری بات کو ان سنی کر دی اور اس حسین لڑکی کے ہر ہر عضو کو رشک اور حسد کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں حیران کبھی اس لڑکی کو دیکھتی اور پھر کبھی ان ساری متحیر لڑکیوں کو جو سراپا سوالیہ حملہ ہو کر رہ گئیں تھیں۔ جیسے اُس حسین نوشگفتہ پھول کو وہ اپنی آنکھوں میں بسا کر ہی دم لینگی۔ تھوڑی سی دیر میں وہ معمہ لڑکی ہمارے سامنے سے گذر گئی۔ کالج کے گیٹ پر اس نے ایک لمحہ کے لئے رک کر ہم سب کو عجیب طور سے پلٹ کر دیکھا۔ ایک خاص شان استغنا سے مسکرائی اور ہلکے سے طنزیہ تبسم کے ساتھ وہ گیٹ کے باہر ہو گئی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو کب تک مجھے اس طرح دیکھتی رہو گی؟ میں بھی تمہاری طرح باغ جوانی ایک

نو شگفتہ پھول ہوں۔ پھر یہ حیرت کیسی؟ ـــــ یہ حیرانی کیوں؟"
اُس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی پھر سے ہلچل پیدا ہوگئی۔ دنیا اپنے ازلی سفر پہ چلتے چلتے صرف ایک لمحہ کیلئے رک گئی تھی لیکن اب وہ پھر سے چلنے لگی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کائنات سہم گئی ہو، ٹھہر گئی ہو، ٹھرا کر رک گئی ہو۔ میں نے حیران حیران نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا ساری لڑکیاں ایک ساتھ بول رہی تھیں سب کی سب ـــــ ـــــ اور جیسے سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ایک گروہ کے قریب جا کر پوچھا۔
"بھئی ـ یہ کیا معمہ ہے آخر؟ تم سبھوں پر اس قدر سکتہ کیوں طاری تھا؟ ـــــ اور وہ لڑکی تھی کون؟"
پہلے تو ساری لڑکیوں نے مجھے گھور کر دیکھا جیسے میرے صحیح جذبات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہوں ـ پھر ساجدہ نے کسی قدر مطمئن ہو کر اُداس لہجے میں کہا۔
"تم کتنی خوش نصیب ہو حسنا جو تمہیں اس لڑکی کا راز معلوم نہیں۔ ورنہ تمہارا دل بھی ہمارے دلوں کی طرح آتش دان بنا رہتا۔" اس جواب سے میری حیرت میں اور اضافہ ہوگیا۔ میں نے

پھر ایک دوسری لڑکی سے پوچھا۔ "مگر یہ لڑکی ہے کون؟ خاصی خوبصورت ہے!!"

تو تمہیں واقعی معلوم نہیں کہ یہ کون ہے؟ یہ ان دنوں وقت پر حکومت کر رہی ہے محترمہ ــــــ دلوں پر حکومت کر رہی ہے اور اب ادب پر حکومت کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے" معینہ نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟؟" میں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔ میرے اس سوال نے اُنہیں بُری طرح خاموش کر دیا اور اچانک سب خاموش ہوگئیں۔ جیسے اُن کے دلوں پر برچھے چل رہے ہوں اور جیسے خاموشی ہی میں اُنہیں سکون ملتا ہو۔

"بھئی یہ کیا معاملہ ہے آخر؟ تم سب خاموش کیوں ہو؟ بتاتی کیوں نہیں؟ ــــــ خدا کے لئے بتاؤ نا ــــــ کچھ تو بتاؤ۔ـ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ لیکن سب کی سب خاموش تھیں کچھ دیر کے لئے سبھوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہوں ــــــ ہمارا تو دل نہیں چاہتا ــــــ تم بتا دو نا بیچاری کو!"

اتنے میں گھنٹی بجی اُس اُداس سی فضا میں برقی گھنٹی کی

باریک اور تیز آواز بُری طرح گونجی اور سب کی سب خاموشی کے ساتھ اٹھکر لیکچر ہال میں چلی گئیں۔

دوسرے دن میں لائبریری میں بیٹھی سویرا پڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک سناٹا چھا گیا۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب کی نظریں میز کے آخری سرے پر تھیں۔ میں ذرا آگے کو جھک گئی۔ وہی پیاری، پیاری شکل کی لڑکی مختلف رسائل اُلٹ پلٹ رہی تھی جیسے کوئی منتخب شدہ رسالہ کی تلاش میں ہو۔ اب میں نے اطمینان کے ساتھ اس کا جائزہ لیا۔ گورا رنگ، شگفتہ پھول جیسا چہرہ، سیم تن، اور بڑی بڑی سنہری آنکھیں، نہ جانے کیوں مجھے اُس کی آنکھوں کا رنگ بے حد پسند آیا۔ گہری گہری بادامی شکل کی آنکھیں، لانبی لانبی پلکوں کے بوجھ سے جھکی جھکی سی نظر آرہی تھیں۔ اس کے ہونٹ یاقوت کی طرح سرخ اور نارنگی کی شاخوں کی مانند رس بھرے تھے۔ سیاہ گھنے بال اس کے گورے چمکیلے رنگ پر بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے اور اس کی پتلی کمر تک لہراتے ہوئے بڑے پیارے لگتے تھے۔ اُس لڑکی کی انگلیاں بھی بے حد خوبصورت تھیں۔ سفید سفید مخروطی انگلیوں کے نوکدار ناخنوں میں قرمزی پالش

عجیب بہار دے رہی تھی۔ سب اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں لیکن وہ کسی کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ اس کی سنہری آنکھوں کی چمک۔ اس کے رخساروں کے ابھرے ہوئے گلابی گلابی حصوں پر پڑ رہی تھی، جیسے کشمیری سیبوں پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی زرد زرد سی کرنیں پڑ رہی ہوں وہ کمال بے خودی سے مطالعہ کر رہی تھی جیسے اسے دنیا و مافیہا سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ مجھے دوسری لڑکیوں پر ہنسی آ گئی اور اپنے قریب بیٹھی ہوئی سیدہ سے میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"وہ تو ہم سب کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور تم سب اسے کیوں پاگلوں کی طرح گھور رہی ہو؟"

"سیدہ نے کتاب سے اپنے دہانہ کے قریب اوٹ کر کے دھیمے لہجے میں کہا "ان صاحبہ کا دماغ تو ساتویں آسمان پر ہے وہ کیوں ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے لگیں۔" سیدہ یہ کہہ ہی رہی تھی کہ وہ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور اپنی ساری چیزیں میز ہی پر چھوڑ کر کتب خانہ سے باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی چار پانچ لڑکیاں اس کی چیزوں پر بری طرح ٹوٹ پڑیں۔ میں خاموش بیٹھی یہ دلچسپ تماشہ دیکھتی رہی۔ لیلا نے اس کی

ریشمی اور معطر دستی کو ہوا میں لہرا کر کہا "ارے ننھے منے رومال! تو خود اپنی مالکہ کی نفاست پسندی کا بین ثبوت ہے!!"
پھر سب نے جلدی سے اس سفید ریشمی رومال کو اپنے ہاتھوں میں باری باری لیا۔
"کتنا مہین اور نرم ریشم ہے ——— کسی نے کہا
"ہائے کیسی بھینی بھینی سی خوشبو ہے اس میں۔" دوسری بولی،
اور کسی جذباتی لڑکی نے تو اسے سونگھ کر چوم ہی لیا۔ اس حرکت پر سب ہنسنے لگیں اور پھر سب اس چھوٹے سے خوشنما ڈبہ پر ٹوٹ پڑیں جو رسالہ میں ترک رکھنے کی خاطر رکھدیا گیا تھا۔ اس ڈبہ کو کھولتے ہی وہ بھی چھکنے لگا۔ ایک خوش رنگ ننھا سا فونٹن پن، دو چار الائچیاں ایک سنہری چھوٹی سی نوٹ بک اور ایک فرنگی سینٹ کی چھوٹی سی شیشی تھی۔ لیلا نے شیشی پر نام پڑھا۔
سیونت ہیون (Seventh Heaven) اور اب سمجھ میں آیا کہ محترمہ ہمیشہ ساتویں آسمان کی سیر کیوں کرتی رہتی ہیں۔" ایک دبا دبا سا قہقہہ پڑا اور پھر بڑی گھبراہٹ سے ساری چیزیں جوں کی توں رکھدی گئیں اور پھر سے وہی پراسرار خاموشی چھا گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لڑکی گھبرائی گھبرائی سی آئی

اور اپنی چیزیں اٹھا کر بڑی عجلت سے چلدی۔ جیسے اسے کوئی بہت ضروری بات یاد آ گئی ہو۔ اس کے جانے کے بعد تقریباً ہر لڑکی کا جی پڑھنے سے اُچٹ گیا۔ اور جمائیاں لیتی ہوئی مرجھائے چہرے والی لڑکیاں یکے بعد دیگرے کتب خانے سے باہر جانے لگیں۔

دن گذرتے گئے اور ان کے ساتھ کالج کی رنگین زندگی کی مختلف منزلیں بھی گذرتی گئیں۔ بزم اتحاد کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ کالج کو عروس نو کی طرح سجایا گیا تھا۔ ہر درخت کے پتہ پتہ میں برقی قمقمے لگائے گئے تھے اور رنگ برنگی جھنڈیاں بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ بازی گاہ کے میدان میں شامیانہ لگا کر اس میں مخملی فرش کیا گیا تھا۔ صوفے کرسیاں اور اسٹیج بڑی خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ ہر لڑکی اپنے بہترین لباس میں تھی۔ جوان قہقہوں سے ساری فضا گونج رہی تھی۔

میں بھی اپنی بنارسی اوڑھنی اوڑھے شامیانہ کے آخری حصہ میں بیٹھی گپیں ہانک رہی تھی کہ ایک دم سے چہل پہل رک گئی۔ اور ساری لڑکیاں ایک طرف دیکھنے لگیں میں نے بھی کھڑے ہو کر دیکھا۔ سنہری آنکھوں والی لڑکی ایک عجیب شانِ استغنا سے ہماری طرف آ رہی تھی اس کے سڈول

جسم پر چاندنی کی طرح سفید ریشمی لباس تھا۔ گھنے اور سیاہ بالوں کو بڑی خوبصورتی سے سجا کر اُن کا جوڑا باندھا گیا تھا جس میں گل شبو کی سفید سفید ادھ کھلی کلیاں لگائی گئی تھیں۔ صراحی دار گردن میں جگمگاتے ہوئے ہیروں کا ہار تھا۔ کانوں میں سچے موتیوں کی چاند بالیاں تھیں اور بلوری کلائیوں میں ہیرے کی چوڑیاں تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے پریوں اور پھولوں کی شہزادی آرہی ہو۔ آج اس کی آنکھوں میں معمول سے زیادہ مٹھاس تھی اور وہ بات بات پر مسکرائے جا رہی تھی۔ پاس ہی سے ایک نے کہا۔ "میٹھی میٹھی آنکھوں والی شہزادی آگئی — !!!"

معینہ نے ہنسکر کہا۔ "شہزادی نہیں ہیروئن کہو —— میٹھی آنکھوں والی ہیروئن !!"

زرینہ نے ذرا تن کر کہا۔ "ہاں ہاں ہیروئن ہی تو ہے وہ —— اگر وہ ہیروئن نہ ہوتی تو اتنی دور سے ایک انجان پردیسی کو اس کی مقناطیسی کشش کیسے کھینچ لاتی۔ اب تو بیچارہ پردیسی ڈوب گیا پریم ساگر میں —— بلاشبہ وہ ہیروئن ہے !!"

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور پھر سیدّہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی اور وہ بھی کسی ہندوستانی فلم کی ہیروئن نہیں بلکہ ملک کے سب سے

ہونہار ادیب کی ہیروئن ـــــــ اس کے ہر افسانے کی ہیروئن!!!"
مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ "کہا یہ انور کے ہر افسانے کی ہیروئن ہے؟؟ بھئی یہ پردیسی فن کار تو بڑا خوش نصیب نکلا"۔ میں نے سیّدہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"اور نہیں تو کیا ـــــــ سنا ہے کہ اس کے ہر ہر لفظ میں ایک ایک جملہ میں اس خوش نصیب لڑکی کے دل کی دھڑکنیں سمائی ہوئی ہیں۔ اس کا سارا فن ثمینہ کا بڑا ممنون ہے اگر یہ اس کے دل پر حکومت نہ کرتی تو آج اس کا فن اس قدر پختہ اور جان دار نہ ہوتا سنا ہے کہ ثمینہ سے ملاقات سے پہلے فن کار انور کے تخیلات کی بھی ایک ہیروئن تھی۔ اور جب حیدر آباد آنے کے بعد انور کی ثمینہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے محسوس کیا جیسے اس کی تخیلاتی ہیروئن اس کے سپنوں کی رانی ایک عرصہ بعد اب اسے بخش دی گئی ہو۔ ـــــــ بھئی یہ ساری باتیں اس پردیسی فن کار نے خود اپنی کئی کہانیوں اور ڈراموں میں لکھی ہیں اس لڑکی نے تو انور کے علاوہ جواد کو بھی متاثر کر کے اس سے اپنی زیر طبع کتاب کا دیباچہ لکھوایا ہے۔ بڑی خوش قسمت ہے یہ کمبخت!!!" سیّدہ بولی۔

"اچھا تو یہ بات ہے!! مگر سیّدہ! یہ سب باتیں کالج بھر کو

کس طرح معلوم ہوئیں آخر؟؟ یہ تو شاید اس حسین لڑکی کی رشک آمیز زندگی کا سب سے اہم راز ہے۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ ہمارے کالج کی اکثریت اسے جانتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

سیدہ میری بکواس سن کر ہنس پڑی اور بولی تم بھی عجیب لڑکی ہو حسنا۔ کیا تم نے دسمبر کے "فن کار" میں انور کا وہ افسانہ نہیں پڑھا سنہری آنکھیں؟؟ "نہیں تو کیا مضمون تھا اس کا؟" ۔ میں نے پوچھا۔

"اجی بھولی رانی۔ وہ سارے کا سارا افسانہ انہیں محترمہ کے حسن کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ ان کی ایک ایک خوبی کو اس قدر فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ہر پڑھنے والے کے سینہ پر رشک و حسد کے سانپ لوٹ جائیں۔ تم خوش نصیب تھیں جو تم نے وہ افسانہ نہیں پڑھا!!" ۔ ذکیہ نے جل کر کہا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے سیدہ اور ذکیہ سے عاجزی سے کہا۔

"پیاری دوست! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے کچھ تو بتاؤ کیا مضمون تھا اس کا؟"

"سمیتہ کو ایک انوکھی خوشبو سے تشبیہہ دی گئی ہے اور لکھا ہے کہ جب اس کی مہک پردیسی فن کار تک پہنچی تو وہ بیقرار ہو کر

پروانہ اپنے دل کے سکون کی تلاش میں حیدرآباد چلے آیا۔" سیدہ بولی

"یہ تو کوئی انوکھی بات نہیں ہے اور نہ اتنی اہم کہ اسے اتنا طول دیا جائے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

ذکیہ ہنس کر بولی —— اجی محترمہ! یہ تو ننھی منّی سی تمہید تھی۔ آگے چل کر تو فنکار نے اس کے جسمانی حسن کو غضب کے انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے —— وہ لڑکی وہی گڑیا جیسی سُرخ و سفید رنگ کی لڑکی، جس کے ہونٹ یاقوت کی طرح سُرخ ہیں۔ جس کی سنہری چمکیلی آنکھوں میں معصومیت اور جوانی کی عجیب سی نورانی چمک ہے۔ جو ایک محبت بھرا دل اپنے پہلو میں رکھتی ہے اور جس کے نازک نازک حنا مالیدہ قدموں میں میں نے اپنا دل رکھ دیا ہے!!!"

"کیا واقعی ؟؟ —— یہ پردیسی واقعی بڑا ظالم نکلا۔ اتنا صاف صاف اعتراف اور اس قدر تعریفیں ؟ —— بھئی واللہ —— کیا مزے کی بات ہے!!!" میں نے بے اختیار کہا۔

"ہی کیا اور بھی لکھا ہے۔ بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کی نیکی کا بیان۔ اس کے اچھے پن کا تذکرہ، اس کے شرمانے کا انداز، اس کی گفتگو کی مٹھاس، غرض کیا کیا نہیں ہے اس افسانے میں

——اب تمہیں زبانی کہاں تک سنائے۔" سیّدہ بولی۔ تعجب اور حیرت سے میں آنکھیں پھاڑے کبھی ذکیہ کو، کبھی سیّدہ کو اور پھر کبھی ثمینہ کو دیکھتی رہی۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور سب اپنی اپنی نشستوں پر جم گئیں۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہو رہی تھی۔ مگر میرا جی بھی رشک و حسد کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں ثمینہ کو دیوانہ وار تک رہی تھی جو صدر جلسہ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو —— تم صدر ہو تو کیا ہوا —— حقیقت تو یہ ہے کہ اس جلسہ کی صدارت میں کر رہی ہوں —— دیکھو نا —— سارے مہمانوں کی نگاہیں مجھ پر ہیں!!" صدر نے اچانک چونک کر ثمینہ کی طرف دیکھا۔ جس کے جواب میں اس کے یاقوت جیسے ہونٹ مسکرائے اور اس کی سنہری پیاری آنکھوں نے کہا —— یقین نہیں آتا تمہیں؟ تو —— دیکھو نا —— ہے اس جلسے میں کوئی ایسی آنکھ جو مجھے نہ تک رہی ہو۔ تمہاری جانب ایک آدھ اچٹتی نظر پڑی کہ گھوم پھر کر میرے چہرے پر پھر سے آن پڑی —— اب تو میں ان نظروں کے بوجھ سے تھکی جا رہی ہوں!!"

کوئی نصف گھنٹہ تک جلسہ کی روئداد سنائی گئی اور اس کے بعد بحث و مباحثوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن ہر مقرر کی نگاہ بھی

اسی شگفتہ پھول جیسے چہرے پر تھی ——— بھئی اور کچھ بتاؤ نا سمینہ کے بارے میں ———" میں نے ذکیہ سے سرگوشی کی۔

ذکیہ مسکرا پڑی اور بولی ——— "تمہارے ڈھنگ بھی کچھ نظر نہیں آتے بی حسنا! ذرا سنبھل جاؤ۔ سنا ہے کہ اس ناگن کا کاٹا کبھی اچھا نہیں ہوا۔" میں نے ذکیہ کے بازو میں زور سے چٹکی لی اور کہا ——— !

مگر یہ جلن، یہ رقابت تم لڑکیوں میں کیسی جاگی، اس آگ میں تو مخالف جنس جل رہی ہوگی۔ تم فضول چھوکریوں کو یہ مرض کیسے لاحق ہوگیا ———؟"

سیدہ بھڑک کر درمیان میں بولی ——— اری پگلی ہے۔ ہم میں سے ہر لڑکی یہی چاہتی ہے کہ کاش میں سمینہ ہوتی اور ملک کا سب سے ہونہار ڈرامہ نگار، سب سے کم عمر فنکار، میرے حسن کی بھی یوں ہی تعریف کرتا۔ میری محبت میں دیوانہ بنا رہتا ہے ——— یہی تو ہماری رقابت کی وجہ ہے جنس سے اسے کیا تعلق؟ ——— اور تم نے سنا نہیں ہماری مملکت کے سب سے مشہور اور ہر دل عزیز ادیب نے بھی اس کی کہانیوں سے متاثر ہوکر اس کے فن پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے!!"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔۔۔ "واہ بھئی واہ۔۔۔ کیسی عجیب خواہش ہے تم سبھوں کی۔ بھلا یہ سوچنے سے کیا فائدہ کہ کاش میں سمینہ ہوتی۔ کاش میں انور کے ہر افسانہ کی ہیروئن ہوتی، کاش جو آدمی میرے فن پر بھی ایک رومانی مضمون لکھتا:۔۔۔۔ کاش !!۔۔۔ کاش !!!"

"بڑی علامہ بنی باتیں کررہی ہے جیسے اس کے دل پر کوئی تاثر ہی نہیں ہوا ہے۔" ذکیہ نے میرے زور سے چٹکی لی۔

"میں بلاشبہ تم لوگوں کی طرح کم ظرف نہیں ہوں۔ مجھے کسی لڑکی پر نہ رشک آتا ہے، نہ حسد ہوتا ہے، یہ تو تم فضول چھوکریوں کی گھٹی میں پڑا ہے کہ جہاں کہیں کسی کی تعریف سنیں بس جل مریں!" میں نے فخر سے کہا۔

"حنا۔ یہ نہ کہو کہ ہم چھوکریاں ہی اس حسینہ سے حسد کررہی ہیں۔ ابھی ہماری لیکچرار صاحبہ تک اس اہم واقعہ سے متاثر ہوئی ہیں اور انہوں نے خود مجھ سے فرمائش کی ہے کہ کبھی میں انہیں بھی سمینہ سے ملاؤں۔ انہیں اس کو دیکھنے کی بڑی آرزو ہے۔ انور کا وہ افسانہ پڑھ کر وہ بیقرار ہوگئی ہیں۔ انکی شدید تمنا ہے کہ ایک دفعہ سمینہ کو دیکھ لیں۔" زرینہ جواب تک خاموش بیٹھی ہوئی

باتیں سن رہی تھی بولی۔
"مگر یہ کون سی مشکل بات ہے؟ سمینہ تو اسی کالج میں زیرتعلیم ہے کہا وہ اسے یہیں نہیں دیکھ سکتیں جو اس معمولی کام کو آرزو اور تمنا سے معنون کرتی ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"پیاری دوست! سمینہ نے سائنس کالج سے ام۔ یس۔ سی کیا ہے اور یہاں ہمارے کالج میں بی ایڈ کرنے آئی ہے۔ ہفتہ بھر میں ایک آدھ روز اس کی کلاس ہوتی ہے اور وہ اسی دن تھوڑی دیر کے لئے کالج آجاتی ہے!!" زرینہ بولی۔
"مگر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ہماری ہندی کی لیکچرار مسز پنڈت سمینہ کے خلاف کالج بھر میں پروپگنڈہ کرتی پھرتی ہیں چند لڑکیاں کہہ رہی تھیں مجھ سے اس کی کیا وجہ ہے بھلا؟" میں نے اپنے دل کی بات کہدی۔ زرینہ نے غصہ سے مسز پنڈت کی جانب دیکھا جو سمینہ کو چور نگاہوں سے تک رہی تھی۔
"اس حسین چہرہ سے مکروہ صورت اور بیمار جسم کا مقابلہ کر کے جل مرتی ہونگی —— کہاں ایک شگفتہ تازہ پھول اور کہاں ایک سوکھا، سہما، بیمار کانٹا!!!" زرینہ بولی۔
"نیز وہ فضول قسم کے مضامین لکھا کرتی ہیں اور کالج میگزین میں

انہیں شایع کر کے سمجھتی ہیں کہ مجھ سی ادیبہ اس ملک بھر میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ آخر وہ سمینہ سے نہ جلیں تو کیا تم سے اور ہم سے جلینگی؟"۔ ذکیہ بولی مجھے ان عجیب و غریب انکشافات کو سُن کر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ میں نے کہا۔ "کس قدر تنگ نظر ہیں یہ لوگ ——— اور پھر دعوے کرتے ہیں کہ ہم ادیب ہیں، ہم فن کار ہیں، ہم دُکھتی رگوں کو پہچان سکتے ہیں!!"

سامنے والی صف میں بیٹھی ہوئی متعدد لڑکیاں جھنجھلا کر ہماری طرف پلٹ گئیں جیسے پوچھتی ہوں ——— "تم لوگ بحث سننے آئی ہو یا خود ہی آپس میں بکواس کرنے؟"

اور ہم مجبوراً خاموش ہو گئے۔

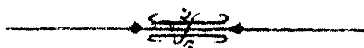
جلسہ کے اختتام پر جب سب گھروں کو جانے کے لئے اپنی گاڑیوں کا انتظار کر رہے تھے، وہ سنہری آنکھیں چمیلی کے منڈوے کے قریب چمک رہی تھیں۔ میری اس سے نظریں ملیں تو میں وہاں ٹھہر نہ سکی۔ میں ہمت کر کے اس کے قریب پہنچ گئی اور ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ "سمینہ صاحبہ! آپ کو آج کا جلسہ پسند آیا؟"۔ وہ اپنا روپہلی نام سن کر جیسے چونک پڑی اور پھر بڑے ہی پیارے انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔

"معاف کرنا بہن! جسے دوسرے پسند کرتے رہیں۔ اس کی جانب گھورتے رہیں، اس کے متعلق آپس میں سرگوشیاں کرتے رہیں، وہ غریب کیا پسند کریگی۔ وقت بھی تو ملے اسے کہ وہ اپنے دماغ سے سوچے، سکون قلب سے غور کرے، اور پھر خوش ہو کر محظوظ ہو سکے!!!"

اس سادہ جواب پر مجھے بے اختیار پیار آگیا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں عجیب ملکوتی چمک تھی اور خوبصورت ہونٹوں پر بڑا پیارا تبسم رقصاں تھا نہ جانے کیوں میں اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔ اور ایک بار تو میری آنکھیں جھک ہی گئیں۔

نہ جانے رعب حسن تھا ——— یا جذبۂ عقیدت ———!!!

"بات کیا ہے بہن؟" اس نے چپکے سے پوچھا ——— اور سنہری آنکھیں مسکرا پڑیں۔



راستے میں رک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں

لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں

اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

(مجاز)

اے غمِ دل کیا کروں؟!!

(ایک خط)

قیصر صاحب!

ایک طویل خاموشی کے بعد آپ نے خط لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ کیسے ادا ہو شکریہ اس لطف و کرم کا۔ حیرت ہے کہ آپ جیسے مصروف انسان کے سینے میں بھی دل ہے اور اس کی بے قراریاں کسی غم نصیب اور مجبور لڑکی کو مخاطب کرنے کا تقاضہ بھی کرتی ہیں!

* آپ نے جو شکوے اور شکایات کے پل باندھے ہیں ان کا مجھے عرصہ سے انتظار تھا۔ میں اپنی بھٹکی ہوئی راہوں پر کچھ دیر کے لئے ٹھیر گئی تھی کہ آپ کے اس پل پر سے بھی گذرتی چلوں مگر زندگی کی سحر سے شام ہو گئی پر آپ کی خاموشی کا مہرہ ٹوٹنا تھا

اور نہ ٹوٹا۔ اور میں بہکے بہکے قدموں سے دور ــــ بہت دور نکل گئی۔ اتنی دور کہ جہاں سے واپس آنا ناممکن ہے۔ پھر میرے کانوں میں ہواؤں کے دوش پر سوار آپ کے خط کی پراسرار آواز گونجنے لگی ــــ اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو آنکھوں سے سب کچھ اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ راہ بھی گم شدہ تھی جسے عبور کرکے میں اتنی دور ــــ افق کے قریب والے اندھیرے میں چلی آئی تھی۔ اندھیرے کی چمکیلی تاریکی میں میرا دل ڈوب رہا تھا۔ قدم بہک رہے تھے۔ اور زندگی کی شام ہوا چاہتی تھی ــــ کہ میں بادل کے ایک دبیز ٹکڑے کا سہارا لے کر ٹھیر گئی۔ آپکی دل دوز باتوں کا جواب دینے کے لئے تھکی ہاری رک گئی۔ آپ کا دل کیسے میلا ہونے دیتی ــــ؟ میں نے جو زندگی بھر ساتھ دینے کی قسمیں کھائی تھیں مستقبل کی انجان تاریکیوں میں ہر قدم پر آپ کو سہارا دینے کی قسمیں کھائی تھیں اپنی مشکلات اور دنیا والوں کی گز بھر کی زبان کی پرواہ کئے بغیر آپ کی محبت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی قسمیں کھائی تھیں اور آج جبکہ آپ نے ماضی کے اُن لرزتے دھندلکوں سے مجھے آواز دی ہے میں کیسے نہ رُکتی؟ آپ مجھے بے وفا نہ سمجھتے ــــ؟؟

قیامت تک آپ میری روح کو کوسنے نہ دیتے رہتے ـــــ؟
ہزاروں شکوک آئے دن آپ کے دل میں پیدا ہوتے اور دنیا والے
آپ کی اس کمزوری اور میری لاپرواہی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے
رہتے۔ اس لئے آج میں بگڑی ہوئی سانسوں کی مدد سے سارے
راز کھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ خدارا ٹھنڈے دل سے
سنیئے اور مجھ سے بدگمان نہ ہو جائیے ـــــ بدگمانی میری نظر میں
جرم سے کم نہیں ہے !!

قیصر ـــــ! یہ بالکل سچ ہے کہ تم مجھے دیوانہ وار چاہتے
تھے اور میں تمہاری اس بے لوث محبت کا اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری
کی وجہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔ اس طرح ہماری کاغذ کی ناؤ ہواؤں
سے بچتی وقت کے دھارے پر ہی جا رہی تھی۔ لیکن ایک دن مجھے
محسوس ہوا کہ تم آپ ہی آپ بہت آگے بڑھ رہے ہو ـــــ اور
تمہارے قدموں میں بجلی کی سی تیزی آ گئی ہے۔ آنکھیں بند ہیں
اور تنفس بگڑا ہوا ہے۔ میں نے کنارے سے دیکھا تو تمہارے
آگے ایک زبردست بھنور کو پایا۔ وہ وقت دور نہیں تھا کہ
اچانک تم منجدھار میں گر پڑتے اور اپنی زندگی کی نازک سی کشتی
کو غرقِ آب کر دیتے ـــــ میں اس خیال سے اس نئے احساس سے

چونک پڑی۔ اور اب میری نظروں کے سامنے تم تھے ـــــ صرف تم! کائنات تاریک ہو چکی تھی ـــــ تمہیں ایک طرف منجدھار کی لہریں کھینچ رہی تھیں اور دوسری جانب تمہاری عزیز زندگی تمہیں منا رہی تھی ـــــ تم جس دنیا سے روٹھ کر جا رہے تھے اُس دُنیا کا ذرہ، ذرہ تمہیں انتہائی خلوص اور محبت کے ساتھ واپس آنے کو کہہ رہا تھا۔ میری چیخ و پکار اور آہ و زاری نے پُرسکون ماحول میں تہلکہ مچا دیا اور لوگوں نے مجھے خاموش کرنے کی، مجھے مایوس بنانے کی بہت کوشش کی۔ دھمکیاں دیں، مذاق اڑایا، گالیاں بکیں۔ ہر ہر طرح سے مجھے اپنے مقصد سے بہکانا چاہا۔ لیکن میرا ارادہ اٹل تھا۔ میرا خلوص میرے ساتھ تھا اور میں پورے یقین کے ساتھ تمہیں واپس لانے کی کوشش و سعی میں سراپا منہمک تھی ـــــ!

اور پھر ایک جگمگاتے دن تم میری طرف پلٹ ہی گئے۔ تمہاری آنکھوں میں مسکراتے آنسو اور ہونٹوں پر ناچتی ہوئی مسرتیں دیکھ کر میں پھولوں نہ سماتی تھی ـــــ ایک قیمتی زندگی کی موجوں میں گھری کشتی کو میں نے اپنے جذبۂ دل سے بچا لیا تھا۔ میری یہ کامیابی ایک شاہکار تھی ـــــ! ایک ناقابلِ فراموش شاہکار ـــــ!!

اچھے قیصر ——— ! تمہاری سچی محبت کا یہ والہانہ اور بے باک ثبوت دیکھ لینے کے بعد میری آنکھیں ایک نئی چمک سے جگمگا رہی تھیں اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ تمہاری اس محبت کے صلہ میں اپنی رشک آمیز زندگی تمہیں دیدوں ——— !

اس اپنے فیصلہ سے میں بہت خوش تھی۔ تم خوش تھے۔ اور میری کائنات خوش تھی۔ لیکن دنیا کو یہ خوشی ایک آنکھ نہ بھاسکی۔ اُس نے اپنے قدیم وتیرے کی رو سے ایک نئے ستم کو جنم دیا۔ اور اپنی ستم ظریفی کو عملی جامہ پہنا دیا ——— !

ایک بھیانک اور تاریک دن۔ زمینوں میں ہزاروں زلزلے۔ سمندروں میں لاکھوں طوفان اور ہواؤں میں کروڑوں آندھیاں آنے لگیں —— بجلی زور سے کوندی اور میری مسکراتی آنکھوں نے اس کی روشنی میں ایک سرگیں آنکھوں والی خاتون کو اپنے سے قریب دیکھا۔ وہ غصّہ سے کپکپا رہی تھیں ایک نامعلوم خوف سے لرز رہی تھیں۔ پھر انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ؛ ——

" نجمہ ! کیا تو نہیں جانتی کہ تو اپنے ان نرم و نازک اور حنا آلودہ پیروں سے کتنی زندگیاں روند رہی ہے ——— ؟

قیصر کی ضعیف ماں بے سہارا ہو ئی جا تی ہے۔ قیصر کی معصوم بہنیں جن کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ جن کی تعلیم و تربیت، شان و شوکت، سرور و مسرت۔ قیصر کی ذات سے بالکلیہ ملحق ہے۔ فریاد کر رہی ہیں۔ اُن کے بھائی نے تیری محبت میں اندھا ہو کر ان سے بولنا، ان کی جانب دیکھنا تک چھوڑ دیا ہے اُسے اپنی بہنوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس کا آباد گھر برباد ہو رہا ہے۔ ان کے خاندان کا مستقبل تاریک ہو رہا ہے وہ تمہیں بد دعائیں دے رہی ہیں۔ تمہاری پر سکون زندگی میں ہلچل مچا ڈالنے کی ترکیبیں سوچ رہی ہیں۔ تمہاری رسوائی و بدنامی پر کمر بستہ ہو گئی ہیں! تم قیصر کو بھول جاؤ۔۔۔ خدا کے لئے بھول جاؤ۔۔۔ انجمہ!! ۔ اس کے ساتھ ازدواج کے رنگین سپنے دیکھنے کی تعبیر الٹی ہے۔ اتنا تو جان لو کہ تم قیصر کی ہرگز نہیں ہو سکتیں۔۔۔ قیصر اپنی ماں کا ہے۔۔۔ قیصر اپنی بہنوں کا ہے۔۔۔ قیصر اپنے خاندان کا ہے۔۔۔ اُسے لوٹا دو۔۔۔ اُسے واپس کر دو!۔۔۔ خدا کے لئے اُسے واپس کر دو۔۔۔!! ۔ اتنی سنگدل تو نہ بنو نجمہ۔۔۔!!!"

مجھے اپنے خوبصورت مستقبل کے شاندار محلوں کے ڈھڑا

دھڑ گرنے کی آواز بادل کی گھن گرج میں سنائی دے رہی تھی ــــ اور میں ہمہ تن گوش بنی اُس دل ہلا دینے والی آواز کو سن رہی تھی کامل اطمینان کے ساتھ ــــ ایسے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اُس کے بعد مجھ سے وہاں ٹھیرا نہ گیا اور میں وہاں سے چل پڑی زندگی کا یہ انوکھا موڑ بھی کتنا عجیب تھا ــــ؟ اب میں تمہاری دنیا سے بہت دور چلی جا رہی ہوں قیصر ــــ! اتنی دور کہ میری تلاش اب دنیا والوں کے لئے ناممکن ہو گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میری پرچھائی بھی تمہاری دنیا میں کبھی نظر آئے اور تم ایک فرمانبردار بیٹے، ایک محبت بھرا دل رکھنے والے بھائی، صرف ایک لمحہ کے لئے ہی کیوں نہ اپنے فرائض بھول جاؤ جو تمہاری اپنی زندگی سے وابستہ ہیں۔ احساس فرض، محبت سے کہیں بڑی چیز ہے قیصر ــــ!!

میں اپنی مٹتی ہوئی رسوائیوں کو اجاگر کرتی، اپنے حنا مالیدہ پیروں سے تمہارے دل کو روندتی اُفق کے قریب چلی جا رہی ہوں اب مجھے کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ میری منزل بہت قریب ہے میں اپنی ناکامیوں، مایوسیوں، اور مجبوریوں کے ہجوم میں گھری وہاں بہت جلد پہنچ جاؤں گی ــــ!

قیصر ــــ!! تم کیا جانو کہ ہندوستانی لڑکیاں کتنی مجبور، کیسی بیکس، اور کس قدر مظلوم ہوتی ہیں ـــــ؟ اُن کے ہونٹوں کی ادھ کھلی کلیوں پر بناوٹی مسکراہٹیں دیکھنے سے کیا ہوگا۔ کبھی ان کے معصوم دلوں کا حال جاننے کی بھی تو کوشش کرو۔ قیصر!! جو زخموں سے چور ہوتے ہیں۔ جس میں ظالم سماج کے لگائے ہوئے کچوکے اور بیدرد مردوں کے کٹھور تیروں کے ہر نشان میں ایک ناسور رستا رہتا ہے جانے وہ لمحے کب آئیں گے جب یہ ناسور تاریکیوں میں چھپنے، رسنے اور بہنے کی بجائے آسمان فطرت پر چمکدار ستاروں کی طرح جگمگانے لگیں گے۔ اور ان کی جگمگاہٹوں سے ظالم سماج کی خونخوار آنکھیں چندھیا جائینگی؟ ـــــ مشرق کی مظلوم بے بس عورتوں کے لئے خدا جانے یہ سنہری گھڑیاں کب آئیں ـــ!! جب تک وہ دن نہیں آئیں گے اسوقت تک یہاں یہ خوفناک داستانیں دہرائی جائینگی۔ بار بار معصوم دلوں کو بڑی بے دردی سے روندا جائے گا ــــ بار بار انسانیت سسک سسک کر تڑپ تڑپ کر دم توڑتی رہے گی ـــــ!

اب اجازت دو قیصر ــــ مجھے ڈر ہے کہ میرے جذبات آج پھر میرا ساتھ نہ چھوڑ دیں!

خدا حافظ ـــــ کبھی تمہاری ـــ نجمہ ـــ!!

اکیلی راتیں، اُداس منظر، یہ ٹھنڈی سانسیں، یہ گرم آنسو

کوئی نہیں ہے تو یادِ ماضی، آ تجھی کو گلے لگائیں!!



ہم نہیں جانتے ہماری زندگی کہاں سے شروع ہوئی !
بس اتنا یاد ہے کہ ہمارے بچپن پر جوانی کی مہین سی چادر چڑھ رہی تھی — شباب ایسے آ رہا تھا جیسے کوئی خوف زدہ چور دھیرے دھیرے، دبلے دبلے قدموں سے کسی بیش بہا خزانہ کی طرف بڑھ رہا ہو اور اس کے ارد گرد گھپ اندھیرا ہو — جیسے اُسے خود اپنا راستہ سوجھائی نہ دیتا ہو — ہر قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہو — اور — اور — دل بے تحاشا دھڑک رہا ہو — !!

ہماری عمریں بارہ تیرہ برس سے تجاوز کر گئی تھیں۔ پھر بھی لڑکپن کا یہ عالم تھا جیسے سات آٹھ سال کے معصوم بچوں کا ہوتا ہے۔ ہمیں نہ تو اپنے جسمانی تغیر کا احساس تھا اور نہ

دماغی تبدیلی کا خیال ــــ ایک مدہوشی سی ــــ میٹھی مدہوشی!!
اور ہم اسکول کی فضا میں کھوئے ہوئے تھے ــــ صبح مدرسہ
جانا۔ آٹھ گھنٹے مختلف مصروفیتوں میں گزار کر شام کو گھر لوٹ آنا
یہی ہمارا معمول تھا ــــ اور یہی کائنات!! ہمارے نزدیک
دنیا کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اور ہم نہیں جانتے
تھے کہ ہمارے وجود کا مقصد کیا ہے ــــ؟

اس بے خبری میں تین چار سال بیت گئے اور ہم ایکدوسرے
کو والہانہ طور سے چاہنے لگے۔ ہماری یہ چاہ ویسی ہی تھی جیسی کہ
ایک دفتر میں کام کرنے والے ایک کلرک کو دوسرے کلرک سے
ہوتی ہے ــــ ہم ایک دوسرے کے ہم جماعت تھے ــــ ہم نوالہ
ہم پیالہ ــــ ہر کھیل میں ہم شریک رہتے۔ مدرسہ کے اسٹیج پر ہم تینوں
ہوتے۔ بعض اوقات ایک ہی رنگ ہم تینوں کو پسند ہوتا ــــ اور
بعض اوقات تینوں کو ناپسند ــــ! یہ ہماری اسکول کی دنیا تھی
جہاں دوست بنانے کے لئے طرفین کی مرضی درکار تھی۔ کٹی ہو جائے
تو پھر ملن کے لئے فرد ثالث کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کہ مغربی
قوموں کے افراد میں تعارف کے لئے ہوتی ہے۔

آہ ــــ کیا دن تھے وہ بھی ــــ! کسی چیز کا احساس ہی

نہ تھا۔ کتابوں کی خیالی دنیا کی بنیاد ہی کھوکھلی ہو تو عمارت کی پختگی کا کیا ذکر؟ ششش ماہی امتحان کے بعد سالانہ امتحان کس قدر جلد آجاتا تھا ــــــ! اور پھر کامیابی کی جو مسرت ہوتی تھی اُس کا بیان ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

کائنات پر ایک نیا رنگ چھا رہا تھا۔ ہر پھول میں کسی کا تصور کوندجاتا ۔ ہر پتہ پر اپنی داستان لکھی نظر آتی ۔ ہر ہندوستانی فلم کی کہانی اپنے ہی سے متعلق ہوتی۔ آہستہ آہستہ دوست کی حقیقت کچھ نرالی ہوتی گئی۔ اور ہمیں اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ رفتہ رفتہ اپنے ماحول کا خیال ہونے لگا۔ اور ہم ہر طرف سے تین ہی نظر آنے لگے۔ ہر زاویہ سے ہمارا مثلث محسوس ہوا جانے لگا ــــــ ان گنت دوستوں کا مجمع چھٹ چکا تھا۔ ہماری حالت ایسی تھی جیسے گھیرے بادل آسمان سے چھٹ جانے کے بعد نظر آتا ہے۔ ہم تین تھے ــــــ دو مسلمان اور ایک ہندو ــــــ!

کالج کی فضاء میں زندگی کا رنگ بدل رہا تھا اور ہمیں ذرا ذرا سی بات کا احساس ہونے لگا تھا۔ اسکول کی فضاء میں ہمارا ساتھی ایک عرصہ کے لئے بھی غیر حاضر ہوتا تو ہمیں

سوائے اس کی نشست خالی نظر آنے کے اور کوئی احساس نہ ہوتا لیکن کالج میں یہ عالم تھا کہ ایک آدھ گھنٹہ کے لئے بھی ہم میں کا کوئی ایک نظروں سے اوجھل ہوتا تو ہماری بیقراری حد درجہ بڑھ جاتی ——— اب دوست کی حقیقت کچھ اور ہی نظر آنے لگی ——— اور ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی سے بن گئے — کتنے بے وقوف تھے ہم ———! اب ہمارے رنگین ماضی کی وہ باتیں یاد آتی ہیں تو بے اختیار میرے آزردہ سے ہونٹوں پر ایک یاس آمیز مسکراہٹ پھیل کر مٹ جاتی ہے ———!!

کالج کے ہر لکچرار کی زبان پر لڑکیوں کے ہر گروہ میں آیا لوگوں کی کانفرنسوں میں ——— ہر جگہ ہم تینوں کا تذکرہ تھا۔ ہر نگاہ ہمیں تجسس سے دیکھتی اور ہمیں اس نگاہ میں رشک و حسد کوٹ کوٹ کر بھرا نظر آتا۔ ہمیں اپنے آپ پر ناز تھا — فخر تھا۔ غرور تھا۔ اور ہماری تمکنت میں ترقی پیدا کرنے کا خیال تھا۔ اچھوں کا خیال برائی کی طرف نہیں جاتا۔ جو اچھے تھے وہ ہمارے اس قرب سے خوش تھے — بے حد خوش! شاید انہیں کوئی نرالی اور انوکھی بات نظر آتی تھی ———

واقعہ بھی یہی تھا۔ کالج میں مختلف گروہ تھے۔ مسلمان لڑکیوں کے درمیان ہندو لڑکیاں نہ تھیں اور ہندو گروہ میں کسی مسلمان لڑکی کا دخل نہ تھا۔ اور اگر تھا بھی تو اتنا گہرا دخل نہ تھا جتنا ہمارے مثلث میں۔ جو برے تھے۔ جو حاسد تھے اور جو ابلیس کے نمایندے تھے۔ انہوں نے شاید ہمارے قلع قمع پر کمر باندھی تھی چنانچہ بہت سوں نے ہمیں ایک دوسرے سے بدگمان کرنے کی کوشش کی۔ طرح طرح کی برائیاں گنوائیں! سو سو طریقوں سے جدا کرنا چاہا۔ بہ ذات خود۔ بہ نفس نفیس ہمارے اس مثلث کو مربع بنانے کے لئے ہزاروں خطوط کھینچے گئے۔ لیکن مثلث۔ پھر بھی مثلث ہی رہا۔ ان لا تعداد خطوط کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مثلث کے ہر زاویہ سے گزر کر چلے گئے۔ ہر خط کو قطع کر کے رہ گئے۔ پر انہیں کنارہ نہ ملا۔ مثلث کے خطوط ایک دفعہ مل چکے تھے ـــــ جدا کیسے ہوتے ـــــ؟ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ چند دن رنجش رہی ـــــ بات بند رہی ـــــ پھر دو دو منہ باتیں ہو گئیں ـــــ ناز و انداز دکھائے گئے پھر ایک مقناطیسی کشش نے تینوں کو دوبارہ ایک دوسرے سے ملا دیا۔ مثلث پر جو گھٹا چھا گئی تھی وہ چھٹ گئی ـــ اور

اس کے خطوط پھر نمایاں ہو گئے۔ ہم تینوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ اپنی جدائی کا ہمیں کبھی احساس ہی نہ ہوا کبھی ——— نہیں ——— !!

لیکن وقت کس کے لئے ٹھہرتا ہے ——— ؟ اس کا پہیہ تو ہمیشہ گھومتا ہی رہتا ہے۔ ہمارے خوش حال دن بھی بیت گئے۔ چار سالہ زندگی میں جنت کی ساری رنگینیاں گھل چکی تھیں۔ اور اب ان خوشنما رنگوں کو مٹنا تھا۔ جنت جہنم میں تبدیل ہوا چاہتی تھی۔ مردہ دل لڑکیاں کہتیں ——— "کالج کی زندگی سے ہم اکتا چکی ہیں۔ کب ختم ہو گی یہ ——— ؟" ہم ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور مسکرا دیتے ——— کوئی کہتی ——— "زندگی ——— ؟ کیا اسی لا اُبالی پن کا نام ہے ——— ؟" ہم اسے خوب بناتے اور جو کوئی مریل سی ادیبہ کہہ اُٹھتی ——— "زندگی کی ڈگر پر چلتے چلتے میں اُکتا سی گئی ہوں !!" ـ تو ہم تینوں کہتے "تو مر مٹو ——— !!؟" اور پھر اس غضب کے قہقہے مارتے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے ساتھ کھِل کھِلا کر ہنس پڑتا ——— اور ہم مسرور ہو اُٹھتے ——— ! ـ اپنی بے وقوفی پر ——— اپنی بے خیالی پر ——— اپنی لاپرواہی پر ——— بلکہ اپنے انجام سے بے خبری پر

——— پھر جس طرح میلہ ختم ہو جانے پر سناٹا چھا جاتا ہے ——— ہر طرف ویرانی و اداسی سی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ——— بالکل اسی طرح ہماری زندگی ——— مثلثی زندگی کا میلا ختم ہو چکا تھا ——— چار دنوں کا میلہ تو گیا ——— چودہ سال کا میلہ بھی ختم ہو رہا تھا اور ہماری قسمت کے خطوط ایک دوسرے سے دور ہٹ رہے تھے ——— مثلث مٹ رہا تھا پر اس کا نقش اب بھی باقی تھا ——— گہرا نقش ——— جو کسی کے مٹائے نہ مٹے گا ——— وقت کا بیدرد ہاتھ بھی اُسے نہیں مٹا سکتا ——— ہاں شاید ایسا ہی ہو ——— !!

نرگس مثلث کا دایاں خط ترقی کی جانب مائل بہ پرواز تھا ——— لیلا بایاں خط بھی نرگس کے عین مقابل چل رہا تھا اور میں ——— خط استواء آج بھی اپنی جگہ قائم و دائم ہوں۔ مجھے اپنی قسمت کے اس نئے خط پر چلنے کے لئے مثلث کی حدود سے نکلنا پڑا اور سچ تو یہ ہے کہ میں ہی اس مثلث کی تخریب کی ذمہ دار ہوں ——— جبراً ——— قہراً ——— اور مجبوراً ——— !!

اور پھر چھم چھم چھم ——— !! سپنا ٹوٹ گیا ——— کہانی ختم ہو گئی ——— خواب ادھورے رہ گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ ہماری زندگیاں ایک دوسرے سے متصل نہیں بلکہ منفرد ہیں

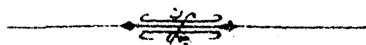
ہر قسمت ایک دوسرے سے مختلف ہے ــــ اور ہر ایک کو اپنے اپنے، قسمت کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے۔ منزل ایک ہی پر تینوں کے راستے جدا ہیں۔ کوئی راستہ پھولوں سے بھرا ہے۔ اور کوئی کانٹوں سے بنا ہوا ہے۔ چلنا ہی پڑیگا۔ ہم نے سوچا ــــ ہماری محبت ہنسی سے، خوشحالی اور سادگی سے شروع ہوئی تھی۔ اسے ختم بھی اسی طرح ہونا چاہئیے۔ ہمیں اپنی جدائی پر آنسو تک بھی نہیں بہانا چاہئیے ــــ محبت کا یہی تقاضہ ہے ــــ زمانے کا یہی تقاضہ ہے ــــ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے ہمارے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ جسم کانپ رہے تھے۔ روح لرز رہی تھی ــــ آنکھیں غمناک تھیں، پر ہونٹ متبسم تھے ــــ ہم ہنس رہے تھے رو رو کے ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے کے دل کا حال بخوبی جانتے تھے کہ اُس پر کیا بیت رہی ہے۔ پر اظہار کی جرأت نہ تھی ــــ ہمارا مثلث ــــ خوشحال مثلث ــــ (HAPPY TRIO) کے نام سے مشہور تھا اور ہم کبھی اس لقب کو سن کر پھولوں نہ سماتے تھے ــــ خود ہمارا بھی یہی خیال تھا ــــ اُداسی، مایوسی، مجبوری اور ناکامیوں سے معرا، مثلث!!

ہم اپنی کامیابی پر نازاں تھے۔ اسے قائم رکھنے لئے ہم نے اپنے دلوں کے لاکھوں غم چھپائے تھے ـــــ اختتام کے وقت بھی اسے قائم رکھنا ہی ہماری کامیابی تھی ـــ ہماری زندگیوں کے ساز کی خاموشی میں کتنے پوشیدہ راگوں کا شور بیتاب تھا۔ ہماری جدائی کی گھڑی آگئی تھی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں بے طرح چھا گئی تھیں۔ شاید آفتاب بھی اپنا منہ چھپا لینا چاہتا تھا۔ آسمان کی کج رفتاری مشہور ہے۔ لیکن وہ سنگدل بھی ہمارے دکھ میں شریک تھا ـــــ اوس کی بوڑھی اور جہاں دیدہ آنکھوں سے جھڑی لگی تھی۔ ہوائیں بیقرار تھیں اور شور مچا مچا کر ہمارے دلوں کی دھڑکنیں چھپا رہی تھیں ـــــ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے ـــــ ہم ایک دوسرے سے مصافحہ کر رہے تھے ـــــ پر ہم ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے ـــــ؟

جس طرح ہم روزانہ کالج سے گھر جاتے ہوئے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے اسی طرح آج بھی کہہ رہے تھے ـــــ عارضی اور دائمی جدائی میں کوئی فرق نہ تھا ـــــ نہ ہم نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالیں اور نہ ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دئے

——— محبت کو قائم رکھنے کا عہد و پیمان ہماری زبان سے دور تھا
جو زبان سے ادا نہ ہو رہا تھا وہ آنکھوں کے ذریعہ پورا ہو چکا تھا
——— ہمیں اچھی طرح اس کا احساس تھا کہ ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے
ہیں ——— ! لیکن ہم اسے بھول جانا چاہتے تھے ——— ہنسی کے پردہ دل
میں اپنے آنسو چھپا لینا چاہتے تھے ——— محبت کے پریشاں خواب
کو نیند سے دور رکھنا چاہتے تھے اور ہم جدا ہو گئے ——— اور ہمارے
آنسو ہمارے دل میں اور ہماری آواز میں اور ہماری روح میں
تحلیل ہو کر رہ گئے ——— !

ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور دل زخموں
سے چور تھے ——— اُن آنسوؤں کی تکلیف کوئی سوچ بھی تو نہیں
سکتا جو آنکھوں ہی میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں ——— اور ———
ڈھلکنے بھی نہیں پاتے ——— !!!



ہو جاؤں میں بھی گم کہیں تیری تلاش میں

تیری طرح مجھے ہے تیری جستجو پسند

تلاش

آج اُسے پُر بہار پھولوں کی تلاش تھی ——!
وہ اپنے پائین باغ کے چپہ چپہ کا جایزہ لے رہی تھی جہاں
نرگس و نسترن اور سوسن و سنبل کے خوبصورت پودے
اپنی بہار دکھا رہے تھے یاسمیں اور جوہی کی پھیلی ہوئی بیلیں
ٹوٹی پڑتی تھیں —— رات کی رانی کی مہک، گلاب، چمپا
اور مولسری کی بھینی بھینی خوشبو سے فضائیں جاگ رہی تھیں!
اُس نے ہر پھول کو دیکھا —— ہر کلی کا دل ٹٹولا ——
لیکن جانے کیا بات تھی کہ اُس کی تلاش آسودہ نہ ہو سکی! اسے
ہمیشہ سے کلیاں پسند تھیں —— کلیاں —— سمٹی سمٹائی
کلیاں —— جھکی جھکی کلیاں —— لجائی شرمائی کلیاں ——!!

وہ کلیوں کو اپنی ہم عمر سہیلیاں سمجھتی تھی ۔ راز داں، ہم مذاق
اور شوخ و شریر سہیلیاں جنہیں شرمانے اور مسکرانے کے
سوائے کوئی کام نہ تھا۔ نسیم کے دل نوش کن جھونکوں سے
یہ کنواریاں اور بھی سمٹ جاتیں ۔۔۔ لجاتیں ۔۔۔ شرماتیں
اور ہولے ہولے مسکرانے لگتیں ۔۔۔ اُن کے اس مسکرانے
اور لجانے میں بھی کتنی نزاکت تھی ۔۔۔ کس قدر لطافت تھی ۔!!
لیکن آج اُسے کسی کلی نے بھی نہیں لبھایا ۔۔۔ کسی
کلی نے بھی اپنی نیم باز آنکھوں سے اُسے اشارہ نہ کیا ۔۔
کسی گستاخ کلی نے اس کا سفید مہین اور ہواؤں میں
قلابازیاں لگاتا ہوا دوپٹہ نہیں تھاما ۔۔۔ وہ سب روٹھی
روٹھی ۔۔۔ انجان انجان تھیں ۔ کوئی پھول بھی اُس کی
نگاہوں میں کھب نہ سکا ۔۔۔ وہ ڈھونڈتی پھری ۔۔۔
اور مایوس ہو کر حوض کے کنارے بیٹھ گئی ۔۔۔ اور اُس نے
فوارہ کا بٹن دبا دیا ۔۔۔ فوارہ پھوٹ نکلا ۔۔۔ آسمان کی
طرف اٹھے ہوئے کام دیو کے مرمری تیر نے تھوڑی سی دیر
میں ساون بھادوں کا سا سماں باندھ دیا ۔۔۔ ہوائیں
سرسرانے لگیں، اودی اودی گھٹائیں جھوم جھوم کر آئیں

اور آسمان کے ہر حصہ پر چھا گئیں ــــــ کوئلوں نے کوکنا
شروع کر دیا اور پپیہے نے "پی کہاں ــــــ پی کہاں"
کی رٹ لگا دی ــــــ اور وہ بھیگتی رہی ــــــ ہنستی رہی ــــــ
ہنستی رہی اور بھیگتی رہی ــــــ اور اس کی چست ریشمی
قمیص اُس کے جوان، تندرست، اور خوبصورت جسم سے
چمٹ گئی ـ چہرے کی کندنی رنگت نکھر گئی ــــــ انگ انگ
میں مستیاں کوند گئیں ــــــ حنا مالیدہ پیروں سے وہ ہلکے
ہلکے رقص کرنے لگی ـ اور دھیرے دھیرے گنگنانے لگی
ــــــ ہُولتی ہوئی شفق کی تیز و نرم کرنیں اسے دمکاتی رہیں ـ
جگمگاتی رہیں ــــــ جگمگاتی رہیں اور دمکاتی رہیں ــــــ
وہ تھرکتی رہی ــــــ بے خود سی ــــــ مدہوش سی ــــــ اور پھر
یہ بے خودی، یہ مدہوشی، اُسے خوابوں کی ایک حسین
طرب افزا دنیا کی طرف لے اُڑی ــــــ جہاں صرف وہ تھی
اور اس کا محبوب ــــــ اس کے محبوب نے اُسے اپنے سے
اس قدر قریب پایا تو بے قرار ہو کر اُس نے اُسے اپنے
بازوؤں میں جکڑ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا:
"اب آسمانوں کی سیروں سے لوٹ بھی آؤ نا ــــــ!"

وہ چونک پڑی ــــــ بے خودی سے خودی میں آ گئی اور پھر ــــــ شرم سے اس کی بوجھل پلکیں جھک گئیں ــــــ ہوائیں سرسرانے لگیں ــــــ فضاؤں پر مستیاں چھا گئیں اور دونوں خراماں خراماں ٹہلنے لگے ــــــ جھومتے ہوئے مچلتے ہوئے اور ــــــ فضاؤں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے

"تم باغ میں نہانے آئی تھیں؟" محبوب نے پوچھا۔

"نہیں ــــــ!"

"تو پھر؟ ــــــ"

"مجھے تلاش تھی ــــــ!؟" وہ بولی

"کس کی ــــــ؟!"

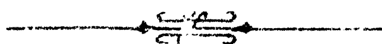
"نوشگفتہ پھولوں کی اور نوعمر کلیوں کی ــــــ لیکن مجھے مایوسی کی اندوہ ناکیوں نے گھیر لیا اور میں بے بس ہو کر رہ گئی!" وہ بولی

"اس میں مایوسی کی کیا بات تھی بھلا؟ موسم کے لحاظ سے ان دنوں پھولوں کے تختے اداس ہیں۔ نہ ان میں رنگینیاں باقی ہیں اور نہ نکہتیں قائم ہیں ــــــ میری طرف دیکھو ــــــ!"

میں گلشن آباد محبت سے دو خوبصورت کلیاں
تمہارے لئے لایا ہوں ـــــ ان میں میرے دل کی رنگینیاں
چھلک رہی ہیں ـــــ میری محبتیں مہک رہی ہیں ـــــ
انہیں قبول کر لو ـــــ انہیں اپنے دامن میں چھپا لو ـــــ
ان کا انگ انگ تمہارے نازک لبوں کے لمس کیلئے
تڑپ رہا ہے ـــــ مچل رہا ہے ـــــ !" وہ دھیمے
لہجہ میں بولا ـــــ !

وہ اس کی باتوں کو سن کر جھوم اٹھی ـــــ مسکرا پڑی
اور ان کلیوں کو اپنی بادامی آنکھوں سے لگا لیا ـــــ
چوم لیا ـــــ اور اپنے سینے کی عمیق ترین گہرائیوں میں
چھپا لیا ـــــ !

وہ کلیاں اس کے محبوب کے آنسو تھے ـــــ گرم گرم
آنسو جن میں دیوتاؤں کی راجدھانیاں اور رادھاؤں کے
رقص منعکس تھے ـــــ
ـــــ اور اس کی تلاش آسودہ ہو چکی تھی ـــــ !



لبِ حسیں پہ تبسّم کی موج لہرائی

اب التجائے محبّت میری قبول ہوئی

التجا

میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ——!! میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں ——!!! آج شام ہی سے فضا بے حد اداس ہے۔ اس کھوئی کھوئی سی نیم غنودہ فضا میں نہ جانے کیوں آج دل بے اختیار دھڑک رہا ہے جیسے دھڑکتے دھڑکتے سینہ سے باہر آ ہی تو جائے گا ——!

زندگی میں گلابوں کی رنگینیاں گھل مل رہی ہیں۔ جوانی اپنے پورے شباب پر محبتوں اور الفتوں کی چاشنی کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ لیکن دل —— دل تو کوئی دس سال سے ناکامیوں اور مجبوریوں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال سا ہو چکا ہے —— مسلسل ناکامیوں اور مایوسیوں نے اسے عین بہار میں مردہ سا کر دیا ہے اور

ان بے چینیوں اور بے قراریوں کی پیہم مصیبتوں نے اس بیکس پر اس بے دردی سے قبضہ جما لیا ہے کہ وہ ہلکی سی جنبش بھی نہیں کر سکتا ــــ سانس بھی آتی ہے تو چوروں کی طرح ڈرتی ہوئی سہمی ہوئی ــــ گھبرائی ہوئی!!

میری زندگی کا فیصلہ جلد ہونے والا ہے ــــ بہت جلد اور میں اس فیصلہ کو روکنا چاہتی ہوں پر روک نہیں سکتی ــــ میری زبان پر لاج اور شرم کا تالا لگا ہوا ہے میری روح بید مجنوں کی طرح کانپ رہی ہے لیکن جسم ایسا ساکت ہے جیسے کسی گھاٹ کا پتھر! آنسو سہمے ہوئے ہیں لیکن نگاہیں شاداب ہیں ــــ مسرور ہیں ــــ مخمور ہیں میرے دل پر ہزاروں برچھے چل رہے ہیں۔ لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹیں رقصاں ہیں ــــ شادمانیاں مسرور ہیں اور مسرتیں نغمہ زن ہیں ــــ!

یاد ہے تمہیں انجم ــــ؟ زندگی کی ایک رنگین شام کو تم نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا ــــ اس پر میں چونک پڑی تھی ــــ میں نے سہم کر تمہاری آنکھوں کا جائزہ لیا تھا ــــ تمہاری خاموش نگاہیں چیخ چیخ کر اپنی خاموش

محبت کا مجھے یقین دلا رہی تھیں اور پھر نہ جانے کیوں میری آنکھیں خود بخود جھک گئیں اور شرم سے میرے گال سرخ ہو گئے اور میں خوشی سے بے اختیار جھوم اٹھی ——! میرا خیال تھا میں جو تم سے مانوس ہو چلی ہوں وہ اس کا ردِعمل ہے میری خاموشیوں نے تمہیں اکسایا۔ میری لاپرواہیوں نے تمہاری ہمت بڑھا دی۔ میری بے معنی مسکراہٹوں نے تمہاری تسلی کا کام کیا —— اور تم "منجدھار" کی جانب بجلی کی سی سرعت سے بڑھنے لگے۔ تمہیں اپنے آپ تک کا ہوش نہ رہا۔ تم آگے بڑھنا چاہتے تھے اور بڑھ رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ تمہیں روک لوں لیکن نہ جانے وہ کونسا اجنبی جذبہ تھا، نہ جانے وہ عورت کی فطرت کا کونسا اجنبی پہلو تھا جس کی وجہ میں تمہیں روک نہ سکی —— میں تڑپتی رہی —— مچلتی رہی —— پر میں تمہیں روک نہ سکی ——!

وہ منحوس دن مجھے آج بھی یاد ہے —— مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل ہی کا تو واقعہ تھا۔ اس بھیانک دن ہمارا "راز" افشا ہو گیا اور پھر وہی ہوا جو آج صدیوں سے ہماری اس ذلیل دنیا میں ہوتا آیا ہے۔ ہماری اُس

دنیا میں، جہاں ذلیل سے ذلیل گناہ جائز ہے۔ لیکن جہاں پاک اور منزہ محبت جائز نہیں ــــ لوگوں نے تمہیں ذلیل کیا اور میں حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھی گئی ــــ!!

لیکن اس تند جھونکے نے ہمیں چونکا ضرور دیا۔ تم بھی سنبھل گئے اور میں بھی اپنی خاموشیوں کے بھیانک نتیجہ کو بھانپ گئی۔ چنگاریاں راکھ کے اندر ــــ بہت اندر چھپ گئیں ــ دن بیتنے لگے۔ موسم بدلتے گئے۔ عمریں بڑھتی گئیں اور موت قریب تر ہوتی گئی ــــ دشمنوں نے سمجھا کہ ہماری محبت وقتی جذبہ سے زیادہ اہم نہ تھی اور بات آئی گئی ہو گئی!

لیکن احمقوں کو کیا معلوم کہ راکھ تلے کی چنگاریاں ایک عرصہ کے بعد بھی ہوا لگنے پر پھر سے شعلہ بن جایا کرتی ہیں ــــ انہیں کیا معلوم کہ ہماری عارضی جدائی سے ہماری محبت میں اور زیادہ تپش پیدا ہو گئی ــ دس سال کا طویل وقفہ بھی ہماری محبت کی آگ کو نہ بجھا سکا۔ دس سال کے بعد ایک دوسرے سے پھر ملے۔ اور ہم نے دیکھا کہ ہماری نگاہوں میں پگھلتے ہوئے دل کی نمی اور سہمی ہوئی آہوں کی گرمی رقصاں

تھی ـــــ لیکن نہ جانے کیوں ہم نے ایک دوسرے کو گناہگار تصور کیا ـــــ بے وفا اور بے درد جانا۔ حالانکہ ہم دونوں بے قصور تھے ـــــ ہم دونوں تو وقت اور دنیا والوں کے مظلوم تھے ـــــ!

اور اب پھر ایک بار قسمت کو مذاق سوجھا ہے ـــــ!!
ادھر میری قسمت کا اور اُدھر تمہاری قسمت کا فیصلہ ہوا چاہتا ہے نہ تم مجھے اپنا سکے اور نہ ہی میری یہ تمنا کہ تمہاری شریک زندگی بنوں پوری ہو سکی۔ ہم ایک دوسرے کو والہانہ چاہتے تھے اور چاہتے ہی رہے۔ اور شاید آخری سانس تک چاہتے ہی رہیں گے ـــــ!

میں نے اپنے دل کے راز مدتوں سے اپنے سینہ کی عمیق ترین گہرائیوں میں چھپا رکھا ہے اور یہ راز زندگی بھر یوں ہی میرے سینے کی گہرائیوں میں دفن رہیں گے۔ مرنے کے بعد بھی کوئی میرے دل کا راز نہ جان سکے گا ـــــ مجھے خود یہ یقین ہے۔ میں ہر مصیبت کو اپنے ضبط وتحمل سے بظاہر مسرت بنا لونگی۔ اور دنیا والوں کو شک وشبہ کی گنجائش تک نہ رہیگی ـــــ لیکن افسوس کہ تم مرد ہو۔ جس کی فطرت

اتھل چشمہ سے زیادہ نہیں ہوتی ــــ مجھے مجبوراً آج یہ کہنا پڑ رہا ہے ــــ کہ ــــ تم مرد ہو کر بھی بزدل ہو ــــ تم ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھبرا جاتے ہو ــــ! خدارا ہمت سے کام لو! انجم ــــ!؟

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تم نے کبھی میرے حسن کی تعریف نہیں کی۔ کبھی بھی نہیں ــــ دنیا کے سارے محبوبوں سے تم بیگانہ نکلے اور مجھے تمہاری اس بیگانگی نے مدتوں ستایا ہے رلایا ہے لیکن میں آج اسی بیگانگی کی وجہ سے خوش ہوں۔ بہت ہی خوش ــــ مجھے تمہیں جیتنے کا ایک آسان سا طریقہ ــ ایک سہل سی ترکیب مل گئی ہے!

انجم ــــ میری نگاہوں میں تمہیں کبھی بھی آہو چشمی کی جھلکیاں نظر نہ آئیں ــ تمہیں میرے رخساروں پر قوس قزح کوندتی کبھی دکھائی نہ دی ــــ میرے ہونٹوں میں گلابوں کی نزاکت تم نے کبھی محسوس نہ کی ــــ میرے لہراتے ہوئے سیاہ بال تمہیں ناگنوں کا تصور کبھی نہ دلا سکے ــــ پھر تمہیں میرے حسن سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا۔ اگر ایسا ہو تو کس قدر تعجب و تحیر کا مقام ہے کہ تم مجھے اپنانے کی مہم میں ناکام

ہو کر پاگل یا مجنوں کا درجہ حاصل کر لو ـــ اور ـــ اور ـــ میری مٹتی ہوئی رسوائیوں کو پھر سے اجاگر کر دو! ۔ شادی اور محبت دو جداگانہ حقیقتیں ہیں انجم ـــ! ایک دو اجسام کا ملاپ ہے اور دوسری دو روحوں کا ـــ تمہیں مجھ سے محبت ہے، تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو ـــ چاہتے ہی رہو میں منع نہیں کرونگی ـــ میں نے کبھی تمہیں منع نہیں کیا ہے ـــ!

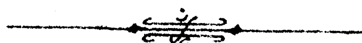
تمہیں یاد ہو گا تم نے بارہا مجھے اپنی "کائنات" کہا ہے اور آج اسی کائنات کی التجا ہے ـــ التماس ہے، آرزو ہے تمنا ہے کہ ـــ تم اپنا بیاہ رچالو ـــ!!!

عشق کے حضور میں حسن کی بھکارن بھیک مانگنے آئی ہے انجم ـــ!! اسے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ ـــ اسے بھیک دے دو ـــ نہیں تو جانتے ہو کیا ہو گا ـــ؟ ساری کائنات کانپ اٹھیگی انجم ـــ اور حسن کا سر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جھک جائے گا ـــ اس بیچاری بھکارن کا دل ٹوٹ جائے گا ـــ اور پھر اسے کوئی جوڑ نہ سکیگا ـــ انجم ـــ کوئی بھی نہیں ـــ تم بھی نہیں!!

میں جانتی ہوں کہ یہ سودا تمہیں بہت ہی مہنگا پڑیگا ـــ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں ـــ تم پریشان ہو جاؤ گے

ممکن ہے کہ تم یہ بھیک دینے سے انکار کردو گے ــــ مگر مجھے دیکھو۔ میں عورت ہوں ــ ایک کمزور، بیکس ہندوستانی عورت ــ جو صرف آنسو بہا سکتی ہے۔ گھٹ گھٹ کر جی سکتی ہے ــ لیکن جو بغاوت نہیں کر سکتی ــ ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتی ــــ! صنف نازک ہو کر جب میں یہ دکھ خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر سکتی ہوں تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم ــ صنف قوی ــ حاکم دنیا ــ بانیٔ سماج اپنے کشادہ مضبوط سینے پر یہ وار نہیں سہہ سکتے ــ؟ سہہ سکتے ہو انجم اگر تم چاہو تو ــــ میں تم سے اب صرف اسی بات کی متمنی ہوں۔ انجم کہ تمہاری زبان سے کبھی اُف تک نہ نکلے ــ اور تمہارے گندمی ماتھے پر کبھی بل نہ پڑنے پائے ــــ یہی شان محبت ہے اور یہی معیار الفت!!

تمہاری مظلوم محبت نازو کی یہ آخری التجا ہے۔ اسے قبول کر لو ــ انجم ــــ میری خاطر ــــ تمہاری "کائنات" کی خاطر ــــ تمہیں۔ تمہاری محبت کا واسطہ ہے اِسے قبول کر لو انجم ــــ!!!



میرے دل کا رنگ چھلک رہا ہے ۔۔۔!"

رضیہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پھولوں کا گلدستہ لے لیا ۔۔۔ محبت کی مہک ۔۔۔! دل کی رنگینیاں ۔۔۔!! رضیہ ایک بار جھوم ہی تو گئی وہ کچھ کہنے ہی کو تھی کہ رضا نے کہا "شکریہ کی ضرورت نہیں رضیہ ۔۔۔! میرے اس حقیر تحفہ کو تم نے قبول کیا یہی بہت ہے ۔۔۔! میری مجبوریاں تمہیں دل کے سوائے اور کوئی قیمتی تحفہ نہیں دے سکتیں"!! رضیہ تڑپ اٹھی۔ اس نے بُرا مانتے ہوئے کہا ۔۔۔ "رضا ۔۔۔ میں دولت کی طلب گار نہیں ۔۔۔ میں دولت لے کر اپنے آپ کو بیچنا نہیں چاہتی۔ مجھے تو دل کی انمول دولت چاہیئے اور وہ تم نے دیدی ۔۔۔ میں اب ہر دولت سے بے نیاز ہوں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔!"

وہ رک گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔۔۔

"لیکن تم بے وفائی نہ کرنا رضا ۔۔۔! عورت کی محبت اور اس کے دل کو ٹھکرانا مردوں کے لئے ایک کھیل سے بڑھکر نہیں مگر عورت اس افتاد کے بعد پھر سنبھل نہیں سکتی ۔۔۔ یہی عورت کی موت ہوتی ہے ۔۔۔!" رضا رضیہ کے قریب ہو گیا اور اور اس نے کہا: ۔۔۔

رضیہ! میں تمہاری محبت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں لیکن تمہارے دولت مند ماں باپ!!! میں اُن کے فیصلوں کو شاید بدل نہ سکوں گا —— پہلے مجھے اس گھر کی ہر چیز پر اختیار تھا۔ لیکن جب سے تمہارے والدین کو شبہ ہو گیا ہے کہ تمہارے دل تک بھی میری پہونچ ہو گئی ہے تو انہوں نے مجھ پر پابندیاں عاید کر دی ہیں —— کیا تم اس سے اُن کے ارادوں کا اندازہ نہیں لگا سکتیں رضیہ —— ؟" رضیہ نے گھبرا کر پوچھا ——

"رضا تمہارے یہاں ہونے کی کسی کو خبر تو نہیں —— ؟"

رضا نے مطمئن لہجہ میں جواب دیا —— "نہیں رضیہ —— !!"

اور اس طرح وہ رات بھی گزر گئی —— ہاں وہ رات رضیہ کی سب سے چمکیلی رات تھی —— رضا اس کا رشتہ دار بھی تھا اور اسکی محبت کا دم بھرنے والا بھی —— ! لیکن رضا غریب تھا! پھر بھی اُس رات غربت نے امیری کو لوٹ لیا —— رضیہ کی سہیلیاں، دلِ سگریٹ کے دھوئیں میں رقص کرنے والی سہیلیاں —— رضا کی محبت کا مذاق اڑا رہی تھیں وہ اُسے اپنی دولت مند رضیہ کے قابل نہ سمجھتی تھیں —— ایک سہیلی نے

تو رضا کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی تھی ـــــ وہ اسکی محبت کو فریب بتاتی! اُس کے دئے ہوئے پھولوں کے گلدستے کی بو اور رنگت سے بھی زیادہ ناپائیدار دھوکہ کہتی ـــــ لیکن رضیہ کو اُس کے رضا پر بھروسہ تھا ـــــ! وہ کسی کی بات پر کان نہ دھرتی۔ لیکن کیا ہماری اس دنیا میں کبھی دو دلوں کو بغیر کسی رکاوٹ کے ایک دوسرے سے ملنے بھی دیا گیا ہے ـــــ؟ یہاں تو ازل سے وہی ہوتا آیا ہے جو دولت مند والدین چاہتے ہیں۔ دولت اور شہرت کے آگے انسانیت کو سر ٹیک دینا پڑا اور رضیہ کے ساتھ بھی وہی ہوا جو ہر اُس ہندوستانی لڑکی کے ساتھ ہوتا آیا ہے جیسے یوں تو ہر چیز پسند کرنے یا ٹھکرا دینے کی آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن شادی کے معاملہ میں جسکی حیثیت ایک بے جان بت سے زیادہ نہیں ہوتی ـــــ!

جب رضیہ نے سنا کہ اس کے والدین اسکی شادی طے کر رہے ہیں تو اسے معلوم ہوا کہ اُس کی شادی ایک رضا کے سوا کسی سے بھی ہو سکتی ہے جو دولت مند ہو ـــــ ساٹھ سال کی عمر ہو تو ہو ـــــ پر بے شمار روپیوں کا مالک ضرور ہو ـــــ رضیہ کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا ـــــ اس کا نیلام ہو رہا تھا

—— اور وہ مجبور تھی —— بے بس تھی —— جس کی بولی زیادہ ہو گی وہ اس کا مالک ہو گا —— خواہ وہ کوڑھی ہو یا جذامی جاہل ہو یا شرابی، شیطان سیرت ہو یا لٹیرا —— بحث صرف دولت سے تھی —— چاندی اور سونے کی آب و تاب انکے مالک کی تمام برائیوں پر دہ ڈالنے کے لئے کافی تھی —— رضیہ کا ننھا سا دل لرز گیا —— ہندوستانی بے زبان لڑکی ——! پھر بھی وہ اپنے باپ کے سامنے بادلوں کی طرح روئی ——! ماں کے آگے بجلی کی طرح کڑکی —— ہر باپ اور ماں نے اپنی بیٹی کی فریاد کو نا قابل اعتنا سمجھا —— رضیہ کے آنسو فریاد بن گئے اور فریاد چیخ —— لیکن ظالم سماج کے فرسودہ قوانین کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی معصوم رضیہ کی یہ بے آواز چیخ شادیانوں میں ڈوب کر رہ گئی۔ اور رضیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہزاد کو سونپ دی گئی ——!!

بہزاد رضیہ کو پا کر خوش تھا —— اس کے خزانے میں اس نئے ہیرے کی آب و تاب نے اجالا کر دیا تھا۔ لیکن دنیا اس سے واقف نہیں تھی کہ اس خوشی کے پس پردہ ازلی افسردگی تیر رہی ہے۔ دنیا تو ہمیشہ ہونٹوں کی مسکراہٹ

دیکھتی ہے ـــــ بے قرار دل کی تڑپ نہیں دیکھتی، سسکتی اُمنگیں نہیں دیکھتی، مچلتی آرزوئیں نہیں دیکھتی، دم توڑتے جذبات نہیں دیکھتی ـــــ!

بہزاد کا دل کسی دوسرے ہی کی تجلیوں سے معمور تھا ـــــ!
معصوم رضیہ اپنے شوہر کے اس راز سے ناواقف تھی۔ شادی کے بعد اُس نے تو یہی دیکھا کہ اُسے بہزاد میں ایک وجیہہ اور دولتمند شوہر مل گیا ہے جو اسکی ناز برداریوں کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ لیکن رضیہ دیکھا کرتی کہ اس کا شوہر اکثر دور خلاء میں نظریں جمائے خاموش نہ جانے کیا سوچا کرتا ـــــ! وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتا اور خود رضیہ بھی جب اکیلی ہوتی اُسے رضا کی یاد اکثر ستایا کرتی اُس نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ رضا کی ناکام زندگی کے تصور ہی سے رضیہ کا دل لرز اٹھتا۔ لیکن وہ آنسو بہانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی ـــ؟ وہ ایک وفادار ہندوستانی بیوی جو تھی۔ اپنے جذبات اور اپنے احساسات کا، اپنے ارمانوں اور اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹنا اپنے مجازی خدا کی پرستش جس کا فرض سمجھا جاتا ہے۔ وہ بے زبان کمزور عورت سوائے آنسو بہانے کے اور کر بھی کیا سکتی تھی ـــــ؟؟

دن گذر رہے تھے ــــ بہزاد اور رضیہ اس طرح زندگی گزار رہے تھے جیسے کسی سرائے میں دو مسافروں کا ساتھ ہو جائے ۔ بیاہتا زندگی میں عورت اور مرد کا ساتھ، زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے ۔ دو دلوں کے اختلاف کو یہ زندگی زیادہ عرصہ تک چھپائے نہیں رکھ سکتی ـــــ ۔

رضیہ نے بہزاد کی بے تعلقی اور سرد مہری کو بھانپ لیا ۔ اور بہزاد نے رضیہ کے دل کے اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کو محسوس کر لیا ـــ دونوں ایک دوسرے کے خطاوار تھے لیکن دونوں اپنے آپ کو مجبور سمجھتے تھے ۔ ایک دن رضیہ نے پوچھ ہی لیا ۔

"آپ نے شادی سے پہلے کسی سے محبت کی ہے ـــ ؟"

رضیہ کے اس عجیب سے سوال پر بہزاد چونک سا گیا ـــ دونوں کی نظریں صرف ایک لمحہ کے لئے ملیں اور پھر فوراً جھک گئیں ۔ اس نے خاموش ہی رہنا بہتر سمجھا ۔

"اگر آپ مجھے اپنا ہمراز بنائیں گے تو میں آپ کی یقیناً کچھ مدد کر سکونگی ـــ !" رضیہ نے جھجکتے ہوئے کہا ـــ

بہزاد نے رضیہ کی طرف نظریں اٹھائیں ـــ اپنی حسین بیوی کی آنکھوں میں انسانی ہمدردی کی جھلک دیکھ کر اس نے

دھیمے لہجہ میں کہا:
"ہاں رضیہ میں کبھی کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا ـــــ!"
رضیہ نے پوچھا ـــــ "اور اب ـــــ ؟"
"اب کسی سے محبت کرنے کو جی نہیں چاہتا رضیہ!!"
"مجھ سے بھی نہیں ـــــ ؟"!! رضیہ نے گلوگیر آواز سے پوچھ ہی لیا۔ بہزاد کی خاموش نگاہیں کچھ کہہ رہی تھیں ـــــ! اُس کی گردن جھک گئی اور اُس نے آہستہ سے کہا:
"رضیہ! میں تمہارا مجرم ہوں ـــــ کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی؟"
"تمہارا کوئی قصور نہیں بہزاد ـــــ! قصور ان کا ہے جنہوں نے تم کو مجھ سے شادی کرنے پر مجبور کیا" ـــــ رضیہ نے جواب دیا۔
"لیکن رضیہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہاری دلجوئی کو اب اپنا فرض سمجھنے لگا ہوں ـــــ!" بہزاد خود کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔
"میں اس بندھن کو خوب سمجھتی ہوں بہزاد جو تمہیں میری طرف بڑھنے سے روکتا ہے۔ لیکن مجھے اس کے لئے تم سے کوئی شکایت نہیں ـــــ کوئی شکوہ نہیں ـــــ!" اور وہ

خاموش ہو گئی۔ اُس نے دیکھا بہزاد کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے لرز رہے تھے۔ رضیہ کچھ دیر اور ٹھیری رہتی تو شاید وہ بھی پھوٹ بہتی لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا اور وہ وہاں سے چلی گئی

اور پھر دن یونہی گذرتے گئے۔ رضیہ کی شادی کے بعد رضا نے محسوس کیا جیسے وہ اس وسیع دنیا میں اب تنہا رہ گیا ہے اس کی مسرتیں اور اس کی آرزوئیں تو رضیہ کی شادی کے بعد ہی دم توڑ چکی تھیں۔ جب وقت کی رفتار کے ساتھ اُس کے دل کا ناسور بڑھتا ہی گیا تو رضا اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کو بھولنے کے لئے اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں چلا گیا

دیہات کی معصوم فضاؤں میں اس کا دل کچھ بہل سا گیا لیکن اب اُسے شادی کر لینے پر مجبور کیا جانے لگا —— اور پھر دنیا والے تو یہ ہمیشہ کہا کرتے ہیں نا —— آسمان کا چاند ہاتھ نہ آئے تو کسی چراغ ہی کو حاصل کر لینا چاہئے

اُسی گاؤں کی معصوم سی فضا میں "کلثوم" ایک جھونپڑی کا دیا تھی رضا نے اسے دیکھا تو اُسے نجانے کیوں بے اختیار رضیہ یاد آگئی اور اس میں ایک محبت بھرے دل کا اُجالا

بھی نظر آیا ـــــ اور پھر مجبور ہو کر اسی نے رضامندی ظاہر کر دی
بہزاد کی پریشاں حالی رضیہ کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی
تھی۔ اسے اب بہزاد سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی ـــ
لیکن بہزاد کی اس تبدیلی نے اس کی امیدوں کے جواب
کو دھندلا کر دیا ـ اس نے ایک دن بہزاد سے پوچھ ہی لیا
کہ آخر اس افسردگی کا سبب کیا ہے ـــ؟ بہزاد نے پہلے
تو پس و پیش کی لیکن رضیہ کے اصرار کے آگے اُسے
سب کچھ کہہ دینا پڑا ـــ
"رضیہ! جس لڑکی سے میں محبت کرتا ہوں اُس کی
شادی ہونے والی ہے ـــ اس لڑکی کی شادی ـــ
جسکو میں نے دنیا کے ہنگاموں سے دور اور فطرت کی آغوش
میں پروان چڑھتے پایا تھا اور جس کے دل کی دھڑکنیں
سن کر میں نے اپنی محبت اس کے قدموں میں نچھاور کر دی
تھی ـــ!" وہ اداس لہجہ میں بولا ـــ "اب اس
لڑکی کی شادی ہو رہی ہے ـــ بلاوا آیا ہے ـــ سوچ
رہا ہوں کیا کروں ـــ!
رضیہ نے کچھ نہ کہا ـ اسکی آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے

آنسو اس کے دل میں اُمنڈنے والے طوفان کی غمازی کر رہے تھے ــــــ! اور پھر وہ دونوں مہمان بن کر کلثوم کے یہاں پہنچ ہی گئے ــــــ

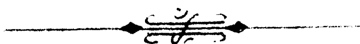
شادی کے سارے مہمانوں میں بہزاد اور رضیہ سب کی توجہ کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ رضیہ نے دولہا کو دیکھا تو سناٹے میں آگئی ــــــ وہ رضا تھا ــــ رضیہ کا رضا ــــــ!

دلہن والوں کا سخت اصرار تھا کہ رضیہ دولہا کے پھول پہنائے رضیہ پھولوں کا گہنہ لئے ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھی ــــــ! رضا نے نظریں اٹھائیں ــــــ! رضیہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی گردن میں گہنا ڈال دیا ــــــ "رضا!" بس وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کے خوبصورت ہونٹ تھرا رہے تھے ــــــ!

بہزاد مہمانوں میں کھڑا اس منظر کو بخوبی دیکھتا رہا کلثوم دلہن بنی ہوئی اس کے آگے لائی گئی تو بہزاد نے رضیہ کو پکارا لیکن رضیہ بے حس کھڑی تھی ــــــ وہ اس وقت اپنے دل کی فریاد سن رہی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور یونہی خاموش کھڑی رہی ــــ!

بہزاد تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اس کے قریب آیا اور
وہ رضیہ کو سنبھالتے ہوئے کلثوم تک لے آیا۔ مہمانوں
میں رضیہ کی اس حالت سے بڑی تشویش پھیل گئی تھی۔
مگر بہزاد نے صحت کی خرابی کا عذر کر دیا۔ دلہن رخصت ہونے
کو تھی۔ اور بہزاد نے آہستہ سے رضیہ کا ہاتھ تھام لیا ——
"چلو گھر چلیں رضیہ ——!!"
وہ بولا —— اب وہاں رکھا بھی کیا تھا
اس کے لئے ——؟
زندگی کی ساری پونجی تو کبھی کے لٹ چکی تھی ——
محبت کا ایک بار پھر گلا گھونٹ دیا گیا تھا —— ہماری
ترقی یافتہ دنیا کے کڑے قوانین ایک بار پھر
دو دلوں کے درمیان آگئے تھے اور زندگی سسک
رہی تھی ——! زندگی کے راستے پر رضا اور کلثوم،
بہزاد اور رضیہ —— ایک ہی منزل کے مسافر تھے
قسمت نے انہیں ایک کٹھن اور صبر آزما راستہ پر
گامزن کر دیا تھا ——!
مگر یہ مسافر کیا کبھی اپنی منزل تک پہنچ سکیں گے؟

یا پھر یہ کٹھن اور لامتناہی سفر ہی اُن کی زندگی ہے ——؟؟ کون جانے ——!!!



"چاہے کسی کی حالت پر ہو ـــــ مگر ہنسی آتو رہی ہے"۔
انہوں نے جواب دیا ـــــ احمد بھیا کے اس جواب پر باجی بے اختیار مسکرا پڑیں۔ ہم سبھوں نے تالیاں بجا کر قہقہے لگائے احمد بھیا کھسیانے سے ہو گئے اور پھر ہنسی اور شور کم ہوا تو باجی نے کہانی پھر سے شروع کی ـــــ
"ہاں تو ہیرو آہی گیا ـــــ طوفان کی وجہ سے وہ پانی میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا ـــــ جیسے ـــــ!"
"جیسے میں ـــــ!!" احمد بھیا نے لقمہ دیا۔ ہم سب ہنسنے لگے۔ باجی کے رخساروں پر قوس قزح کوند گئی!!
ایک چمکیلی دوپہر کو جبکہ باجی اپنی مشین پر کچھ سی رہی تھیں ہم سب اُن کے قریب بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ قاسم نے ایک چٹھی لاکر باجی کے ہاتھ میں دیدی۔ خط پڑھ کر باجی کے چہرہ پر زردی سی چھا گئی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہمارے احمد بھیا کو شدید بخار ہے۔ درد سر کی وجہ سر پھٹا جارہا ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی لکھا تھا۔" زندگی کا چراغ بجھنے ہی کو ہے آخری دیدار کے لئے چلی آؤ ـــــ"

اس خط نے ہمیں بھی پریشان کر دیا اور ہم سب اُن کے کمرہ کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ کوٹھی کے بیرونی حصہ میں رہتے تھے۔ ابا جان کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ ڈاکٹری پڑھنے کے ارادہ سے دہلی میں مقیم تھے۔ دہلی میں ہمارے مکان سے بہتر اور کوئی جگہ ان کو نہ ملی۔ وہ یہیں رہنے لگے۔ اور اُن کی دلچسپ شخصیت نے ہم سب کو اپنا لیا تھا۔ جیسے ہی ہم ان کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ وہ پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹے تو تھے اب لگے کراہنے اور مضحکہ خیز آوازیں نکالنے۔ ان کی آواز سنتے ہی ہم سبھوں کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ لیکن باجی کی سنجیدہ اور متفکر صورت نے ہمیں چپ کر دیا۔ باجی نے بڑے ہی مفکرانہ انداز میں اُنہیں چادر۔ رضائی اور بلانکٹ اُڑھا دیا اور ہم سب سے کہنے لگیں :—

"بچو! بخار کی شدت سے اُنہیں اعضا شکنی بھی ہے، اور دردِ سر بھی۔ اس لئے تم سب کے سب پلنگ پر چڑھو اور خوب دابنے لگو!!"

ہم سب تندہی سے پلنگ پر چڑھ گئے اور بری طرح احمد بھیا پر ٹوٹ پڑے۔ باجی نے فوجی کمانڈر کی طرح ہم

سبھوں کو حکم دیا:۔۔۔۔۔

"زور سے دابو۔۔۔۔ بچو۔۔۔۔ خوب زور سے۔۔۔۔ جتنی طاقت ہو آزمالو۔۔۔ ان کا سارا بخار۔۔۔ کاذب بخار اُتر جائے گا۔ زور سے۔۔۔۔ خوب زور سے!!"

ہم نے سمجھا "کاذب بخار" بھی شاید کوئی بخار ہوگا اس لئے بیچارے احمد بھیا کو اتنا دبوچا کہ وہ پریشان ہو کر ہم سے چھٹکارہ پانے کے لئے بڑی جدوجہد کرنے لگے۔۔۔۔۔

میں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو مجھے رحم آگیا اور میں پلنگ پر سے کود پڑی۔۔۔ باجی نے جب یہ دیکھا تو ہم سب پر بگڑ گئیں۔۔۔۔

"خبردار ان۔۔۔۔ کو بستر سے باہر نہ جانے دینا ورنہ ہوا لگ جائے گی اور اگر انہیں ہوا لگ گئی تو پھر سمجھو تم نے اپنے احمد بھیا کو اپنے ہی ہاتھوں کھو دیا۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے!! انہیں خوب ڈھک دو۔ چہرہ پر بیٹھ جاؤ تاکہ ہوا کہیں سے بھی نکلنے نہ پائے۔۔۔۔ دابو۔۔۔۔ زور سے دابو۔۔۔!"

ہم سب بیوقوفوں نے کود کود کر ان کے سارے جسم پر پھر سے قبضہ جما لیا۔۔۔ اب تو بیچارے احمد بھیا چیخ پڑے۔

"ارے کمبختو ــــ میں مر رہا ہوں ــــ اُترو ــــ!"

"ہاں ہاں دیکھو یہی کاذب بخار کے اُترنے کی علامت ہے، خبردار مت چھوڑنا انہیں ــــ!!" باجی نے حکم دیا ــــ اور ہم سبھوں نے احمد بھیا پر نئی طاقت سے قبضہ جما لیا۔ وہ بڑی مشکل سے ہم سے آزاد ہوئے اور خود پلنگ پر سے کود پڑے ان کا چہرہ سُرخ اور پسینہ سے تر تھا۔ ان کے چمکیلے گھونگریالے بال سارے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ قمیص کے بٹن کھل گئے تھے۔ سارے لباس پر بے شمار جھریاں پڑ گئی تھیں اور وہ بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ وہ پلنگ سے اُترتے ہی باجی کی طرف جھپٹے ــــ

"ٹھیر تو شریر ــــ!!"

اور باجی قہقہہ لگاتی ہوئی بے تحاشا بھاگ گئیں ــــ!

پھر ایک رات جبکہ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور ہوائیں عطر بیز تھیں، کوٹھی کے اطراف و اکناف کے تختے پھول رہے تھے، باغ میں ہر کلی پھول بننے کو بیقرار تھی اور ہم سب آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ میں چور تھی اس لئے اپنے ساتھیوں کو تلاش کرتی ہوئی اُدھر چلی گئی جدھر چنبیلی کا نہایت

خوبصورت منڈھوا تھا۔ وہاں کسی کی آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز سُن کر میں ٹھٹک گئی ——— میرا خیال تھا جھینے والوں ہی میں سے کوئی ہوگا۔ مدن مست کے جھنڈ کی آڑ لیتی ہوئی قریب پہنچ گئی۔ جھانک کر دیکھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ باجی احمد بھیا کے شانہ پر سر رکھی سسکیاں بھر رہی تھیں۔ احمد بھیا انہیں سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ چنبیلی کی کلیاں چٹک چٹک کر پھول بن بن کر ہواؤں سے اٹکھیلیاں کرکے ان دونوں پر نچھاور ہو رہی تھیں۔ میں حیران ہوکر انہیں دیکھتی رہی۔ احمد بھیا کہہ رہے تھے

"میں جانتا ہوں مہرو ——— یہ میری کم مائگی کا نتیجہ ہے جو میں تمہیں اپنا نہ سکا۔ میری تعلیم ابھی ادھوری ہے۔ مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے عرصہ چاہئے۔ تمہارے والدین اپنی جوان لڑکی کو اتنے عرصہ تک کنواری نہیں رکھ سکتے! لیکن مہرو۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی کیوں نہ ہو اپنے آخری دم تک تمہیں نہیں بھولونگا۔ تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش کرکے مجھ پر احسان کیا ہے ——— بہت بڑا احسان ———!! اور جو میں نے تمہیں بھلا دیا تو سمجھنا کہ میری زندگی بھی ختم ہوگئی

میری یہ ناشاد و نامراد زندگی ـــــ!!"

باجی نے اُن کے منہ پر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ رکھ دیا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے۔ میرے آنسو نکل آئے اور میں وہاں سے بادل ناخواستہ چلی آئی ـــــ!

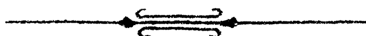
اور پھر دوسرے ہی دن احمد بھیا چلے گئے۔ کہتے تھے اُنہیں دوسرے کالج میں پڑھنے کی ضرورت ہے پھر چند ہی ہفتوں بعد باجی کا بیاہ بھی ہو گیا شادی کے دن وہ بار بار احمد بھیا کی میز پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف دیکھ رہی تھیں ـــــ نہ اُنکی آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ـــــ وہ مرمر کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھیں جس کے کوئی احساسات نہیں ہوتے۔ جذبات نہیں ہوتے ـــــ!

اُن کی شادی کے برسوں بعد ان کے بچے کا نام احمد سن کر میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:ـــــ

"باجی ـــــ! احمد نام تم کو پسند ہے ـــــ؟" تو باجی نے پریشان کن نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اپنے خوبصورت بچے کو گود میں بھینچ لیا جیسے ڈرتی ہوں ـــــ اسے بھی کوئی چھین نہ لے ـــــ انہوں نے کہا:ـــــ

"ہاں فوزی ——— بے حد !!"

شاید ان کا حلق جلتے ہوئے توے کی طرح خشک ہو رہا تھا ——— ! بچے کو انہوں نے چوم لیا۔ اور پھر ان کے زرد رخساروں پر پانی کی دو لکیریں نمودار ہوئیں اور فوراً غائب ہو گئیں جیسے دور کسی ریت کے میدان میں دریا سا بہتا نظر آئے اور غائب ہو جائے۔



۸

یہ سمجھ لو کہ غمِ عشق کی تکمیل ہوئی

ہوش میں آئے تو بھی ہوش میں آئے نہ بنے!

شہلا

پرویز اور شہلا

شہلا اور پرویز کی ملاقاتیں رنگ لانے لگیں۔ کسے
خبر تھی کہ ایک کپتان صاحب کے پتھر دل میں حسن کی
اثر آفرینی اتنا گہرا اثر پیدا کر دیگی کہ وہ عورت سے کھیلنے
کی بجائے اس کی محبت کے پاک اور منزہ جذبات کی
سرشاریوں میں یوں کھو جائیں گے ـــــ اور گستاخ و شریر
نگاہیں آنسوؤں میں ڈوب جائیں گی ـــــ انہونی بات
کس کے وہم و گمان میں آسکتی تھی۔ طرفہ تماشہ یہ بھی تھا کہ
شہلا بھی اپنی ساری احتیاط پسندیوں کے باوجود پرویز کی
طرف مائل ہو گئی! یہ میلان اُسے گہرے پانیوں کی طرف
ڈھکیل رہا تھا۔ فوجیوں کے نام سے بھڑکنے والی شہلا
اب ایک فوجی ہی کا دم بھر رہی تھی ـــــ عورت جب ایک بار

محبت کے راستہ پر قدم اٹھالیتی ہے تو وہ آگے پیچھے نہیں دیکھتی ——— اس کی فداکارانہ خود سپردگی اُسے کہیں کا نہیں رکھتی۔ یہ نہ سمجھئے کہ محبت ایک افسانوی حقیقت ہے۔ اور یہ کہ صرف راد ھاؤں اور دمینتیوں کے دل ہی لطفِ سوز و گداز سے آشنا ہوتے تھے۔ ہر عورت کے سینے میں محبت دھڑکتی ہے۔ شہلا بھی اب محبت کا شکار تھی۔ پرویز جو کچھ بھی ہو شہلا کی نگاہوں میں تو وہ اس کی محبت کا حق دار ہو چکا تھا ——— !

لیکن معصوم شہلا کو کیا خبر تھی کہ اس کے دولتمند والدین نے اپنی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ سیٹھ مراد بخش کا آوارہ لڑکا تین کوٹھیوں اور لاکھوں روپیوں کا مالک، شہلا کی زندگی کو سکھ چین کی نعمتوں سے مالا مال کر دیگا۔ شہلا کے والد اسکی قسمت کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اور انہیں بڑی تشویش تھی کہ وہ جلد ہی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں اور اپنے ارادہ کو عملی صورت اختیار کرتا دیکھیں!

اُنہوں نے پرویز کی ملاقاتوں کو کوئی اہمیت نہ دینی

چاہی لیکن وہ اس طرح ڈھیلی ڈوری بھی چھوڑنی نہ چاہتے تھے وہ اس سے واقف تھے کہ اکثر چور چوکیدار کے باوجود بھی آنکھوں میں دھول جھونکنے سے باز نہیں آتا۔ انہوں نے پرویز کو سمجھایا کہ اب اُس کا زیادہ آنا جانا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ شہلا کی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔ پرویز کو اُن کی باتیں سُن کر ایسا محسوس ہوا جیسے اُنہوں نے دھکے مار کر اسے اپنے گھر سے نکال دیا ہو وہ حیران نگاہوں سے سیٹھ صاحب کو گھورتا کھڑا رہا۔ اُس کی تمنائیں اور آرزوئیں پھولوں کی طرح شاخ سے ٹوٹ گریں۔ وہ مجسم سوال بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا یہ سچ ہے ——؟ کیا میں مایوس ہی ہو جاؤں؟ اور سیٹھ صاحب کی خاموشی کہہ رہی تھی:۔

"ہاں ہاں ——! تمہیں مایوس ہی ہو جانا چاہئے۔ یہ سچ ہے۔ تمہیں شہلا کا خیال اب دل سے نوچ پھینکنا چاہئے کیونکہ میں نے شہلا کے لئے سیٹھ مراد بخش کا لڑکا چن لیا ہے وہ آوارہ ہے تو کیا ہوا۔ جاہل ہے تو کیا ہوا۔ بدصورت ہے تو کیا ہوا۔ وہ اگر شہلا کو ناپسند ہے تو کیا ہوا —— وہ تین عالیشان کوٹھیوں کا مالک جو ہے۔ وہ لاکھوں کی جائداد کا

مالک جو ہے ـــــ مجھے ایسے ہی داماد کی ضرورت ہے ۔!!!"
اور پرویز سے اس گھٹے گھٹے سے ماحول میں ٹھہرا نہ گیا اور وہ چلا آیا۔ وہ اس انتباہ سے اس قدر دل شکستہ ہو گیا تھا کہ وہ شہلا کے قدموں ہی میں اپنی آخری سانسیں لینا چاہتا تھا ـــــ وہ چلے جانے سے پہلے اپنی محبوبہ سے آخری بار مل لینا چاہتا تھا۔ اُسے خود نہیں معلوم تھا کہ اب اس ملاقات سے اس کا کیا مقصد ہے ـــــ

اتنے میں خود شہلا اُسے ڈھونڈھتی آنکلی۔ وہ پرویز سے کچھ کہنے ہی کو تھی کہ سیٹھ صاحب نے اُسے پکارا۔ پرویز کے دو آنسوؤں نے اس کی ساری بیتابی سنادی ـــ پرویز کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سیٹھ صاحب کی آواز دھوئیں کی طرح اُس کے اطراف لپٹی جا رہی ہے اور جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ شہلا کی ملاقات سے اُسے کامل مایوسی ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا باغ کی طرف نکل گیا ـــــ

"پرویز ـــــ! پرویز !!!" شہلا نے اُسے آواز دی ـــــ
پرویز کے دل کو جیسے کسی نے ہوا میں اچھال دیا ـــــ
"پرویز آج تمہیں ہو کیا گیا ہے ـــــ؟ تم اتنے رنجیدہ

کیوں ہو ——— ؟"

شہلا کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں کے کناروں پر آنسو لرز رہے تھے۔ شہلا نے پرویز کا ہاتھ تھام لیا اور پرویز نے محسوس کیا جیسے کسی نے اُسے موت کے منہ سے چھڑا لیا ہو۔ جیسے کسی نے نئے سرے سے اس میں جان ڈال دی ہو۔ وہ مسکرانے لگا ———

"تم جس کے پاس ہو رنج سے اس کو کیا واسطہ شہلا !!"

وہ بولا ——— پرویز اور کچھ کہنا چاہتا تھا ——— وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ماحول نے اُس کی زبان بند کر دی ———

"پرویز ! تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہو ——— ؟ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی ——— !!" شہلا نے روٹھ کر کہا ———

پرویز شہلا کو اس طرح بے چین نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے شہلا سے قریب ہوتے ہوئے کہا ———

"شہلا ——— تمہیں معلوم ہے میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں لیکن دنیا والوں کو ہمارا یہ میل نہیں بھاتا۔ آج تمہارے ابا جان نے مجھے یہاں آنے اور تم سے ملنے سے منع کر دیا ہے اور تم جانتی ہو اس سزا کا میں کیوں مستوجب ہوا ——— ؟ صرف

اس لئے شہلا کہ اب تمہاری شادی ہو رہی ہے !!!"

"پرویز — ؟؟ — پرویز !!" شہلا اس کی مجنونانہ حالت سے پریشان ہوگئی تھی لیکن وہ کہے جا رہا تھا۔

"شہلا۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے — !" پرویز کے لہجہ میں ایک جہاں کا غم امنڈ آیا تھا — وہ اُسے کوئی بُری خبر سنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"لیکن مجھ سے نہیں — مجھ سے نہیں شہلا" اُس نے گلوگیر آواز میں کہا: —

اس کی باتیں شہلا کے نازک سے دل پر نشتر بن کر لگیں اُس سے نہ رہا گیا اور وہ پرویز سے لپٹ گئی —

"نہیں — نہیں پرویز — میری شادی ہوگی تو تم ہی سے ! تمہیں کھو کر میں زندہ نہیں رہ سکتی پرویز — !!!"

پرویز کی ڈھارس بندھی اور اس نے سوچا کہ شاید بیٹی کا یہ عزم باپ کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دے۔

ایک دن اُسے موقع مل گیا اور اس نے شہلا کی شادی سے متعلق سیٹھ صاحب سے پوچھ ہی لیا — لیکن سیٹھ صاحب بادل کی طرح گرجے — بجلی کی طرح کڑکے اور پرویز کی

کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ الٹا ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ اُس رات اُسے شہر چھوڑ دینا پڑا ___ اُسی رات اُسے محاذ پر جانے کا حکم ملا ___ پرویز ایک سپاہی تھا اور اُس کے لئے اب وقت آگیا تھا کہ وہ میدان جنگ میں اپنی جان کی بازی لگاتا۔ پرویز کو اب اپنی جان پیاری نہ تھی۔ وہ موت سے کھیلنا چاہتا تھا ___ شہلا اُس کی نہ ہوسکی تو پھر زندگی کس کام کی ___؟ اور پرویز یہ بھی جانتا تھا کہ اس اچانک بھیجدیئے جانے میں کون کون سے افراد کارفرما ہیں ___!

زندگی کبھی رنگ ہے اور کبھی جنگ۔ پرویز کی زندگی میں جنگ کے بادل امنڈ آئے تھے۔ یہ جنگ اُس دل کو ہمیشہ خاموش کر دینے کے واسطے تھی جو سسک سسک کر مر رہا تھا ___ وہ ایک بہادر کی موت مرنے کا عزم لئے محاذ پر چلا گیا ___ پرویز ہر مرحلہ میں نڈرپن اور بے باکی دکھاتا۔ سر ہتھیلی پر لئے ہوئے آگے بڑھتا لیکن اُسے خود خبر نہ تھی کہ موت بھی اب اُس سے اپنا دامن بچا رہی تھی ___!

شہلا کے والد نے تو پرویز کو اپنی دانست میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اپنے اثرات سے اُسے دور کر دیا۔

اب وہ شہلا کی شادی اپنی مرضی کے مطابق سیٹھ مراد بخش کے بیٹے ہی سے کر سکتے تھے۔ شہلا کا غم ابھی تازہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس معاملہ کو فوراً نہیں چھیڑا۔ شہلا پرویز کی روانگی کا حال سنکر فرط غم سے پاگل سی ہو گئی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ رات میں وہ ایک خواب کی دلفریبیوں میں گم رہیگی اور صبح آنکھ کھلتے ہی یہ خواب ایک ہیبت ناک حقیقت میں بدل جائے گا۔ پرویز اس کا خواب تھا ۔۔۔ کھویا ہوا خواب ۔۔۔۔ اُس سے جدا ہو کر اُداسی اُس کی زندگی پر چھا گئی ۔۔۔ وہ اپنے باپ سے منہ چھپاتی پھرتی ۔۔۔ باپ سے بیٹی کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اُنہوں نے اپنی لاڈلی کو سمجھانے کی ساری کوششیں کر ڈالیں ۔۔ لیکن ایک روگ تھا جو شہلا کو اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔ اس روگ کی دوا کسی کے بس کی نہ تھی شہلا اس وجہ سے بھی زیادہ دکھی تھی کہ پرویز نے جانے سے پہلے اس سے ملاقات تک نہ کی اور ایسی جگہ چلا گیا جہاں موت سے مقابلہ تھا ۔۔۔ شہلا امید و بیم کی دنیا میں بھٹک رہی تھی اور کہیں اُسے پناہ نہ ملتی تھی ۔۔۔!

سیٹھ مراد بخش کے تقاضے بڑھنے لگے۔ اُنہوں نے سُن پایا تھا کہ شہلا کی شادی کے لئے ایک لاکھ روپیہ رکھا گیا ہے۔ ادھر شہلا کے باپ بھی سوچ رہے تھے کہ نیک کام میں دیر اچھی نہیں !!

اور پھر ایک شام ——— شادیانوں کی صدا ساری کوٹھی میں گونجنے لگی۔ نوبت نقاروں کی اور باجوں کی ہڑبونگ مچ رہی تھی۔ اس بلند آہنگ شور میں شہلا کی دبی دبی ہچکیاں کس کے کانوں تک پہونچتیں ؟ ——— دوسرے دن اس کا عقد مقرر تھا کہ اُس رات کسی ہمراز نے اُسے یہ خبر سنائی کہ محاذ سے چند زخمی سپاہی لوٹے ہیں۔ شہلا کا دل دھڑکنے لگا یوں جیسے پھٹ پڑے گا ——— !

پرویز کہیں ان میں نہ ہو ؟؟؟ اس خیال ہی سے وہ کانپ اٹھی۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح پتہ چلا ہی لیا کہ ان زخمیوں کو کس ہسپتال میں رکھا گیا ہے ——— !

شادی کی گڑبڑ سے دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی ——— ہر شخص خوشی سے پھولوں نہ سماتا تھا لیکن دکھیاری دلہن شام ہی سے کچھ متفکر تھی اور کسی کی دھن میں کھوئی سی تھی۔ جب گھر کی

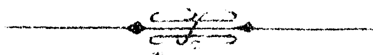
نے رات کے دس بجائے تو رات کی تاریکیوں نے دیکھا کہ شہلا ہسپتال کے گیٹ پر دربان کی منت سماجت کر رہی تھی کہ وہ اُسے زخمیوں کو ایک نظر دیکھنے کی اجازت دیدے۔ چند چاندی کے سکوں کے عوض بڑی مشکل سے اجازت مل گئی۔ اور وہ اندر داخل ہوئی ــــــ وہ ہر مریض کے چہرے کو غور سے دیکھتی ــــــ ایک بار تو اُسے نظر آیا جیسے ہر مریض اس کا پرویز ہے۔ لیکن ایک بستر کے قریب پہونچی تو اسکی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اگر وہ نرس کا سہارا نہ لیتی تو چکرا کر زمین پر آ رہتی۔ اس کا پرویز آخر اُسے نظر آ ہی گیا۔ ہاں وہی تھا ــــ وہی ــــ! بالکل وہی ــــ!!

"پرویز ــــ میرے پرویز!!" شہلا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پکارا ــــ مریض کی آنکھیں نیم وا ہوئیں۔

"پرویز ــــ؟" شہلا جیسے کسی دور کے مسافر کو پکار رہی تھی ــــ لرزتی ہوئی ــــ روتی ہوئی ــــ!!

پرویز اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بے رنگ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی اور پھر اسکی آنکھیں بند ہو گئیں ــــ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں اور ــــ نرس نے

مریض پر کپڑا ڈال دیا— اور شہلا کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ شہلا لڑکھڑاتے قدموں سے ہسپتال سے باہر نکل گئی اور سجے سجائے گھر کی سہمی سہمی سی لرزتی قندیلوں نے دیکھا کہ چند لمحوں بعد وہ بھی پرویز کے "ابدی خواب" میں داخل ہو گئی ہے۔



چھوڑا نہ راز کوئی جہانِ خراب کا

سب کہہ گیا میں خواب میں افسانہ خواب کا

نینوں کے جھروکے سے!

چلے بسلم

تم نے ہارسنگھار کی ڈالی کو لچکاتے ہوئے کہا: "بعض اوقات
"بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے!"
اور میں نے مسکرا کر تمہارے شانے پر سر ٹیک دیا ۔۔۔۔۔ تم
جھوم جھوم اٹھے اور ہارسنگھار کے چند شگفتہ پھول ہم دونوں
پر نچھاور ہوتے ہوئے زمین پر آرہے۔ باغ کے لہلہاتے
ہوئے درختوں میں ہوائیں سرسرانے لگیں ۔۔۔۔۔ فضا پر
رومان سا چھا گیا۔ سامنے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی ریل
زور سے چیخی اور ہم دونوں کے دل زیادہ تیزی سے دھڑکنے
لگے۔ تم نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مجھے
بغور دیکھتے ہوئے کہا: ۔۔۔۔۔
"جس قدر نگاہیں شاداب ہوتی ہیں اسی قدر دل مغموم

ہو جاتا ہے سمینہ ——!!"

میں چونک کر تم سے الگ ہو گئی

"لیکن کیوں ——؟ بتاؤ بھی انجم! —دیکھو میرا دل ایسی باتوں سے بُری طرح دھڑکنے لگتا ہے —اور میں —میں! میں رک گئی —تم نے مجھے اپنے نزدیک کھینچتے ہوئے اپنی نظریں جھکا لیں اور تم غمگین آواز میں کہنے لگے ——

"کچھ ہی دن بعد تم زندگی کی ایک نئی منزل میں داخل ہونے والی ہو سمینہ ——! خلوص اور محبت رکھنے والے اپنے سے بچھڑنے والوں کو ہار پہناتے ہیں۔ جانے والوں کی راہ میں کانٹے نہیں بچھاتے ——دل کی کتنی گہرائیوں سے یہ آرزو امڈتی ہے کہ تمہاری زندگی کا وہ نیا دور شاد کامیوں اور مسرتوں سے ہم کنار رہے ——!" تمہاری خوبصورت آنکھوں سے موٹے موٹے قطرے ٹپک رہے تھے ——

میں تمہاری طرف دیکھ کر تلملائی ——سہمی اور تڑپ تڑپ گئی ——

"یہ تم کیا بک رہے ہو انجم ——؟ خدا نہ کرے جو میں تم سے بچھڑوں —اگر یہ سب ٹھیک ہوتا تو اتنی رات گئے

خاندان کی عزت اور دنیا والوں کی لمبی زبان سے بے پرواہ آج تمہارے یہاں نہ آتی ——— میرے انجم! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے اس محمود سے دلی نفرت ہے اور میں ——— تمہیں ———!"

"مگر میں نے سنا ہے کہ تم محمود کی جانب مائل ہو" تم بولے میں نے دوسری طرف منہ پھیر کر کہا ———

"انجم ——— ! بدگمانی میری نظر میں جرم سے کم نہیں!" میری آواز میں کرختگی تھی ———

"پھر بھی سمینہ! محمود نہ سہی کوئی اور سہی لیکن سوائے اس بدبخت ——— جاہل اور مفلس انجم کے تم کسی سے بھی بیاہی جا سکتی ہو ——— مگر انسان صرف کھانے کپڑے کیلئے ہی تو زندہ نہیں رہتا ——— کچھ اس کا دل بھی تو چاہتا ہے ——— اور سمینہ جو میرا دل چاہتا ہے وہ مجھے نہیں ملتا۔ کوئی میری طرف ہاتھ بڑھاتا بھی ہے تو اُسے جھٹک دیا جاتا ہے اس کھیل میں ہار میری ہی ہوتی ہے ——— سب ہنستے ہیں اور میں دل ہی دل میں روتا ہوں!"

"بس کرو انجم ——— مجھ میں اب تاب نہیں ——— ! میری بدنصیبی!"

اور میں نے تمہارے لرزتے ہوئے گرم گرم ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھدیا اور تم نے میرے چکراتے ہوئے سر کو اپنے شانے کا سہارا دیا۔

خود کو سنبھالو سمینہ! تم جیسی عقلمند اور تعلیم یافتہ لڑکی کو مایوس ہونا زیب نہیں دیتا —— بدنصیبی تو میری اپنی ہے تم تو یقیناً ایک بہت ہی دولتمند تعلیم یافتہ اور خوش نصیب آدمی کی بیوی بنو گی ——!!"

اس طنز کے تیر نے مجھے بے چین کر دیا۔

"انجم ——! تمہیں میرے دل کے پرخچے اڑانے میں مزہ آتا ہے ——؟"

تم نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور مجھے جھنجھوڑ کر کہنے لگے

"سمینہ! تم تو ان مہ جبینوں میں سے ایک ہو جنہیں دیکھ کر ماہ و انجم کانپ جاتے ہیں ——!"

"ہوں —— کیا خوب!! اُترآئے خوشامد پر؟ ہٹو میرے راستہ سے —— میں لوٹ کر گھر جا رہی ہوں —— مجھے تمہاری اس بزدلی کی خبر نہ تھی —— اسی صورت پر دعویٰ تھا کہ میں تمہاری یاد میں آنسوؤں کا انمول خزانہ ساری ساری

رات لٹاتا رہتا ہوں۔ اور میں تمہیں سجدہ کرتا ہوں۔ نماز میں بھی میرا معبود تمہارا ہی سیمیں پیکر ہوتا ہے ۔۔۔ !' باتیں بنانے کے سوائے تم مردوں کو آتا ہی کیا ہے ۔۔۔؟ اپنی محبوبہ کے سامنے دنیا کی ساری رنگینیاں گھول گھول کر اسے اپنی بے غرض محبت کا یقین دلاتے ہو۔ اس کی پرستش کرتے ہو۔ اس کے قدموں پر گڑگڑا کر محبت کی بھیک مانگتے ہو ۔۔۔ اور جب کسی مہربان کے سامنے یہ راز افشا ہو جاتا ہے تو ایسے انجان بن کر نکل جاتے ہو جیسے تمہیں اس بدنصیب لڑکی کے نام ہی سے نفرت ہے ۔۔۔ !لیکن انجم ۔۔۔ مجھے تم پر ناز تھا۔ اور میں اس رنگین دھوکہ میں تھی کہ میرا ۔۔۔۔ میرا انجم ۔۔۔۔ !!!"

میرا گلا رندھ گیا اور میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

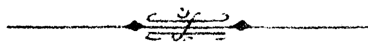
"سمینہ پیاری ۔۔۔ جانِ آرزو! اس قدر دل نہ کھاؤ۔ میں تو تمہاری بھلائی کی خاطر کہہ رہا تھا ورنہ یقین مانو مجھے تم سے زیادہ خدا بھی عزیز نہیں۔ تم سے الگ رہ کر میں کبھی زندہ بھی رہ سکتا ہوں ۔۔۔؟ شاخ کو درخت سے جدا کر دیا جائے تو پھول اپنے آپ مرجھا جاتا ہے سمینہ ۔۔۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ دیکھو ۔۔۔ وہاں دور ۔۔۔ آسمان پر چاند کس قدر مسرور ہے۔ وہ

حسن اور عشق کو یکجا دیکھ کر پھولوں نہیں سماتا ـــــ!" اور تم نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آنے لگیں۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی شروع ہو گئی ـــــ ہار سنگھار نے اپنا سارا خزانہ لٹا دیا ـــــ تم اور میں جھومتے ہوئے اسٹیشن پہونچے تاکہ کہیں بھاگ چلیں ـــــ دور ـــــ بہت دور ـــــ دنیا کی آنکھوں سے دور ـــــ پریم نگر بساتے ـــــ ریل آئی! اور میں نے دیکھا کہ تم مجھے پیچھے چھوڑے تنہا ـــــ سوار ہو گئے اور میں اسٹیشن پر ہی رہ گئی ـــــ مجمع نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں فٹ بورڈ پر قدم بھی رکھ سکوں۔ انجن نے زور سے سیٹی دی اور تم میری نظروں کے سامنے مجھ سے جدا ہونے لگے میں تمہیں پکارتی ہوئی ریل کے ساتھ دوڑنے لگی ـــــ مجھے چکر سا آیا اور میں لڑکھڑا کر دھم سے گر پڑی ـــــ!!

"سمینہ باجی ـــــ! اٹھئے بھی ـــــ!! انجم بھیا کی برات کلکتہ جا رہی ہے ـــــ وہ دیکھئے کھڑکی میں سے صاف نظر آ رہا ہے ـــــ اسٹیشن پر کتنا مجمع ہے!!"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت دور سے پکار رہا ہو میرا جسم اک بارگی بستر پر لرز اٹھا اور پھر فوراً ہی بعد ٹھنڈا

پڑ گیا ــــ کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ میرے کانوں کی راہ دل تک پہونچا دیا تھا ــــ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ــــ
"میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ ریحانہ اب کیا دیکھوں؟"
میں نے بہ مشکل ضدی ریحانہ سے کہا ــــ
وہ مچل کر بولی ــــ "آپ تو غافل سو رہی تھیں۔ بستر سے اٹھیں تک نہیں ــــ پھر کس طرح دیکھ لیا آپ نے؟
"نینوں کے جھروکے سے!"
میرے منہ سے نکلا اور میں رضائی میں اور ریل فضاء میں سسکیاں بھرنے لگی ــــ!



یہ سُرخ کُندن سی جو ہے رنگت، بدن کی ہے یا کہ پیرہن کی

شراب سے ہی یہ جام رنگیں کہ جام سے ہے شراب رنگیں؟

ایک عید

رومانہ کی بے چین نظروں نے چاند کو دیکھا اور کسی کا جھلملاتا ہوا تصور اس کی آنکھوں میں کوند گیا ـــــ عید اور دید کی مسرتیں کچھ اس طرح گھل مل گئیں کہ وہ کچھ دیر کے لئے چاند اور فاروق دونوں کو بھول سی گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ ہاتھ اٹھتے ہوئے لرزنے لگے۔ اس نے بے خودی میں اپنا ہونٹ دانتوں سے دبا لیا۔ اُسے ایسا معلوم رہا تھا جیسے اس کا دل ان ہونٹوں میں سمٹ آیا ہے اور بڑا دھڑک رہا ہے، دھک دھک !! دھک دھک !! جذبات کی لہریں مچل رہی تھیں اور اس کی آنکھوں کے کناروں پر نمی سی آگئی تھی ـــــ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔!

"آپا آپ کے آویزے آگئے !!" ننھی فرزانہ نے

چیختے ہوئے کہا لیکن روبانہ تصور کے سیلاب میں بہہ رہی تھی جہاں محبتیں آباد ہوتی ہیں ـــــ! وہ فرزانہ کی آواز کو نہ سن سکی۔ اتنے میں فرید دوڑتا ہوا آیا ـــــ

"آپا پھوپی جان آگئی ہیں!" روبانہ جیسے چونک گئی۔ اس نے فرید کو چمٹا لیا۔ پھوپی جان آگئیں ـــــ؟ اس نے محسوس کیا جیسے فرید اس کے دل میں پکار رہا ہے ـــــ

"آپا پھوپی جان آگئی ہیں!!"

فاروق اس کا پھوپی زاد بھائی تھا لیکن وہ صرف عید کے موقعوں پر اس سے مل سکتا تھا روبانہ کی عید تو فاروق کی ملاقات تھی اس کی بہن ریحانہ نئے کپڑوں اور زیورات کی خوشیاں منا رہی تھی، چھوٹے بھائی بہن نئے نئے خوشرنگ کپڑوں کے علاوہ عیدیوں کی دھن میں مگن تھے ـــ لیکن اس نے چاند کی جھلک میں جیسے ڈھونڈا ـــــ وہی اسکی ساری خوشیوں کا مرکز تھا اور پھر فاروق بھی تو روبانہ پر فریفتہ تھا

چاند رات کو عید کی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ کپڑوں اور ملبوسات کا ریہرسل کیا گیا ـــــ زیورات اور چوڑیاں دوکانوں سے تیار ہوکر آگئیں ـــــ جو بھی تھا اپنی ہی فکر

میں باؤلا ہو رہا تھا ۔ کسی کو کسی کی سُدھ نہ تھی ۔ رومانہ پلنگ پر لیٹی تو اُس کی نگاہوں پر یاس و حرماں کے بادل ڈھلک آئے ۔ اُس نے ضبط سے کام لینا چاہا ۔ لیکن اس کے نازک دل نے کمزوری دکھائی اور وہ پھوٹ پڑی ۔۔۔ لیکن کیوں ۔۔۔۔؟ صرف اس لئے کہ الہ آباد سے اُس کی پھوپی کا سارا کنبہ آچکا تھا ۔ لیکن نہ آیا تو فاروق ۔۔۔۔ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا تھا ۔۔۔ اب ایسا کیوں ؟ رومانہ نے سوچا ۔ اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے آتے ۔ قسم قسم کے گمان پیدا ہوتے اور وہ تھم تھم کر برس پڑتی ۔۔۔! رونے لگتی !!

وہ سوچنے لگی ۔۔۔ کیا واقعی وہ اپنے کسی دوست سے ملنے کلکتہ گئے ہیں اور صبح ہی صبح آجائیں گے ۔۔۔؟ لیکن دل کی ٹیسیں کہتیں ۔۔۔۔ کیا معلوم ۔۔۔۔ یقین تو نہیں ۔۔۔۔!!

۔۔۔۔ اس پریشاں خیالی نے اسے سونے بھی نہ دیا ۔ ساری رات فاروق کا تصور اس کے سامنے تھا ۔ اس کا وہ دل آویز تبسّم ۔۔۔ وہ ہنس مکھ چہرہ جو بھی دیکھے اس کا ہو جائے ۔ ایک دم اسے خیال آیا ۔۔۔ کیا وہ کسی دوسری لڑکی ۔۔۔؟

آگے وہ سوچ نہ سکی ـــــ لیکن پھر بھی ـــــ !!
نہیں نہیں ـــــ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ـــــ وہ اس خیال سے ہی کانپ گئی۔ رومانہ دریچے میں بیٹھی آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ ستاروں کی چمک میں اُسے دلاویز تبسم، اور اس کا مسکراتا چہرہ نظر آنے لگا اور اُس کی آنکھوں پر بادل سے چھانے لگے۔ فاروق سے اب دوری اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ صبح اس کی آنکھ لگ گئی اور جیسے کوئی اسی وقت ہی کا تو منتظر تھا۔ رومانہ نے کسی کو خواب میں پالیا ـــــ !

گھڑی نے آٹھ بجائے اور گھر کے سارے لوگ عیدگاہ روانہ ہو گئے ـــــ رومانہ نارنجی لباس میں پری معلوم ہو رہی تھی لیکن اس کے چہرہ پر شگفتگی نہ تھی۔ ایک خاموش اداسی تھی۔ اُس نے آخر دل کڑا کر کے اپنی پھوپی سے پوچھ ہی لیا: ـــــ

"پھوپی جان! ابھی تک فاروق بھائی کیوں نہیں آئے؟" اُس کی پھوپی نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"میں کیا جانوں ـــــ؟" رومانہ کے چہرہ کی اُداسی بہ ر

جیسے دل کا خون دوڑ گیا — وہ ایک آہ بھر کر چپ ہو رہی۔ پھوپی نے کچھ دیر بعد کہا — "کہہ تو رہا تھا کہ عید کے دن کسی طرح ضرور آؤں گا مگر جانے کیا بات ہوئی کہ وہ اب تک نہیں آیا — !" رومانہ نے کچھ نہ کہا — وہ چپ چاپ چھالیہ کترتی بیٹھی رہی — وہ ایک مجسم آنسو دکھائی دے رہی تھی — !

نماز کے بعد ملاقاتیوں اور مہمانوں کا سلسلہ بندھ گیا۔ رومانہ اور ریحانہ کی سہیلیوں سے گڑ بڑ مچ گئی۔ کھیل کود اور گانے بجانے کی دھوم ہوئی مگر مایوس تمنا رومانہ نے کسی چیز میں حصہ نہیں لیا۔ ناسازی مزاج کا عذر کیا تھا۔ بڑی آسانی سے بات نبھ گئی۔ صبح کی شام ہوئی اور عید کی ساری مسرتیں ختم ہو گئیں۔

رات کی تاریکی میں کہیں فاروق کی ٹرین شہر پہنچی۔ اُسے دوستوں نے زبردستی روک لیا تھا۔ اب وہ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا تھا۔ گھر پہنچا تو سب سونے کی تیاریاں کر رہے تھے اور رومانہ اپنے کمرہ میں بند تھی۔ جب سب سونے کے لئے چلے گئے تو فاروق اُٹھا،

اور کوٹھی کے پائین باغ میں جا پہنچا — وہ کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتا رہا — پھر دیکھا تو رومانہ کے کمرہ کی کھڑکی کھلی تھی وہ پھاند کر اس کے کمرہ میں جا پہنچا۔ رومانہ نے فوراً بٹن دبا دیا کمرہ نیلی روشنی میں دمک اٹھا — فاروق کو اچانک دیکھ کر وہ متحیر ہو گئی پھر تیوری چڑھا کر بولی —— "لڑکیوں کے کمرہ میں اس وقت ؟!! شرم نہیں آتی ؟" فاروق نے ہنس کر کہا۔ "محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہے محترمہ !" رومانہ کے چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑ گئی —— وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی تو فاروق بھی بلا تکلف اس کے بازو بیٹھ گیا — رومانہ نے مصنوعی طور پر روٹھ کر دوسری جانب منہ پھیر لیا۔

"رومانہ ! مانا کہ قصوروار ہوں لیکن سزا کے لئے آج کا دن کچھ موزوں نہیں ——!! وہ بولا

رومانہ نے روٹھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"جی ہاں —— آج عید کے دن کسی کو اسطرح انتظار میں تڑپانا بھی شاید آپ کے لئے مناسب ہی تھا ——!!"

فاروق ہنس پڑا۔ محبت کے اس معصوم انداز اظہار پر "مگر سرکار رحم ——!" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— اور پھر

شکوہ و شکایت کے دفتر کھلے۔ اور آہستہ آہستہ ملاپ کی خوشیوں نے زبان پائی ۔ پھر وہ ستاروں کی مدھم اور ٹھنڈی روشنی کا لطف اٹھانے کے لئے دریچے میں بیٹھ گئے ۔ اور انکی پرچھائیاں باہر دیوار پر جھومتی رہیں ۔۔۔!

جب پچھلی پہر کو فاروق کی والدہ نماز کے لئے اٹھیں تو اُن کی نظریں ان پرچھائیوں پر پڑیں ۔۔۔ اُنھوں نے پہچان لیا کہ ایک پرچھائی خود اُن کے برخوردار کی ہے ۔ پھر سارے واقعات انکی نظروں کے سامنے پھر گئے ۔۔۔ انھیں آج پہلی بار احساس ہوا ۔ رومانہ کی بیکلی ۔۔۔ بے چینی بے سبب نہیں تھی ۔ وہ مسکرا پڑیں ۔ صبح کو ناشتہ پر فاروق کی والدہ نے فاروق اور رومانہ کے بیاہ کے متعلق اصرار کیا ۔ وہ اُن ماؤں میں سے نہیں تھیں جو جانتی بوجھتی اپنی اولاد کو جہنم میں جھونکنا چاہتی ہیں ۔ جو اپنی مرضی اور پسند کو مقدم رکھتی ہیں ۔ انہیں اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی منظور تھی ۔ انھوں نے اس کا انتظام بھی کر لیا ۔ پیغام منظور کر لیا گیا اور ۔۔۔ رومانہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی وہ اپنے کمرہ میں پناہ گزیں ہو گئی ۔ کچھ ہی دیر بعد کسی کے مضبوط

ہاتھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

کھٹ کھٹ !! کھٹ کھٹ !!

اور روبانہ کے حلق میں یہ جواب جیسے پھنس کر رہ گیا

"کھلا ہی تو ہے !!"

پڑھی نماز جنازہ کی میری غیروں نے

مرے تھے جن کیلئے وہ رہے وضو کرتے!

چاندنی رات

جب میں سینما سے رات کے ایک بجے واپس ہو رہی تھی تو مجھے کوئی سڑک کے بیچوں بیچ لیٹا ہوا نظر آیا موٹر روک کر ٹارچ کی مدد سے دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئی انسانی مجسمہ لیکن ہڈیوں کے پنجرے سے بدتر۔ کچھ ہی دیر پہلے سینما ہال میں زندگی ایک مجسم رنگینی تھی —— ایک مسلسل قہقہہ تھی —— اور سینما ہال کے باہر انسانیت کی خستہ حالی دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا —— میں نے اُسے اپنی موٹر میں بٹھا لیا وہ دیوانہ قسمت کی نیرنگیوں پر آنسو بہاتے بہاتے ہنسنے والا اب زندگی کی پرچھائیوں سے بھی گھبراتا تھا۔ گھر لا کر میں نے اُس کے زخم کی مرہم پٹی کی پر اُس گھاؤ کا علاج کس کے پاس تھا جو اُسے اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔

وہ جسمانی طور پر رو بہ صحت تھا۔ لیکن ذہنی طور پر شاید وہ اب بھی بیمار ہی تھا۔ وہ اپنا اکثر وقت خاموش گزارتا۔ مجھے بھی اپنے مریضوں سے بہت کم فرصت ملتی لیکن جب کبھی وقت ملتا میں اس سے اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کرتی!

ایک دن میں نے اس کی زندگی کے بارے میں پوچھ ہی لیا تو بڑے اصرار کے بعد اُس نے کہنا شروع کیا ——
"عرصہ ہوا ایک رات ہم سب دوستوں نے ایک چمن میں چاندنی رات منائی تھی کہ کچھ دیر بعد چمن کے جنوبی حصے سے ایک بہت پیاری اور سریلی آواز آئی۔ کوئی بڑی میٹھی لے میں گا رہا تھا —— میں نے درختوں کی آڑ لے کر دیکھا کہ چمن میں آج بہت ساری پریاں جمع تھیں۔ ان میں کی ایک جس کی خمار آلود آنکھیں چاند کو ٹکٹکی باندھے تک رہی تھیں —— مستانہ وار گا رہی تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ اس ایک نظر نے کیا غضب ڈھایا۔ دوسرے دن میں نے پتہ لگا لیا کہ وہ ایک امیر گھرانہ کی لڑکی ہے اور اس کا بھائی یوسف ہمارے کالج میں ہے!

میں نے یوسف سے دوستی کرلی۔ کیوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہاں میں کہاں وہ ــــ!

اور پھر دو ہفتوں کے بعد میں اپنے دوست کے بنگلے پر پہونچا لیکن اس وقت یوسف کہیں باہر گیا ہوا تھا ــــ میں ڈرائینگ روم میں بیٹھا رہا۔ دس منٹ گزرے ہونگے کہ "وہ" گنگناتی ہوئی آئی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گھبرا کر بولا ــــ "جی میں سلمان ہوں۔ یوسف کا دوست!"

"جی واقعی؟" ــــ اُس نے مسکرا کر کہا اور چلی گئی۔ مجھے اپنی حماقت پر بے حد غصہ آیا۔ بھلا کس نے پوچھا تھا مجھ سے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں ــــ؟ میں بہت شرمندہ ہوا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ اُس کے بعد یوسف نے بارہا اصرار کیا کہ میں اُس کے گھر آؤں لیکن ہمت نہ پڑی۔ آخر دو مہینے بعد وہ مجھے زبردستی گھر لے گیا۔ بہت خاطر مدارات کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی عزیز بہن سے میرا تعارف بھی کروایا۔ اس وقت مخمور نے مسکرا کر کہا: ــــ

"آپ ہیں مسٹر سلمان ــــ یوسف

یوسف نے سمجھا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ لیکن میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوا جا رہا تھا۔ اُس نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اُس دن سے میری زندگی میں ایک تغیر پیدا ہو گیا ہر وقت اسی کا خیال ـــــ پڑھائی کے اوقات اُس کے سہانے تصوریں گزرنے لگے اور میں یہ سمجھا ہوا تھا کہ میری طرح مخمور بھی محبت کی آگ میں جل رہی ہے لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ جدید تہذیب و تمدن کی فضا میں سانس لینے والی لڑکی کے لئے مجھ جیسے ان گنت پجاری تھے اُسے تو میری شکل تک یاد نہ تھی ـــــ!!

میری تعلیم کا خاتمہ ہو گیا۔ پے در پے ناکامیوں نے میری کمر توڑ دی لیکن میرا دل مخمور کی شاندار اور امتیازی کامیابیوں سے مسرور تھا۔ کالج میں وہ ایک ممتاز حیثیت کی مالک ہو گئی۔ میرے لئے اس کی کامیابی اور شہرت ایک بیش بہا نعمت تھی۔ مجھے اور کیا چاہیئے تھا ـــــ؟ میں اُس سے بے لوث اور بے غرض محبت کرتا تھا۔ میری محبت کا صلہ مجھے منظور نہ تھا۔ اس لئے میں نے کبھی اظہار کی جرأت نہ کی ـــــ!"

مریض خاموش ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا وہ شاید اپنے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا ——— کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ کہنے لگا ———

"ہاں تو میں نے اپنی محبت کا اظہار کبھی نہ کیا۔ کبھی بھی نہیں وہ اب ڈاکٹر مخمور ام۔ بی۔ بی۔ ایس۔ ہو گئی تھی۔ خوشی سے میں پھولوں نہ سماتا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں اس سال امتحان میں ناکام رہا ہوں۔ اس اثناء میں مجھے والد کے انتقال کی خبر ملی۔ اپنے وطن جا کر سارے معاملات طے کر کے شہر آیا تو معلوم ہوا کہ اُس نے باضابطہ پریکٹس شروع کر دی ہے اور اپنے دواخانہ کا نام "سلمان ہسپتال" رکھا ہے۔ سلمان میرا ہی نام تھا اس لئے میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان تصور کرنے لگا۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بھی میری طرح محبت کی آگ میں جل رہی ہے ورنہ کیوں وہ میرا نام منتخب کرتی ——— فرط انبساط سے جھومتا ہوا میں اُس کے ہسپتال پر پہونچا ——— برسات کے ابتدائی دن تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی

اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ موسم بڑا سلونا تھا
میں نے اُس کے کمرہ خاص میں اس کا انتظار کیا۔
جب وہ چند مریضوں کو دیکھ چکی تو میرے پاس آئی ــــ سادہ
سفید لباس میں وہ بے حد بھلی معلوم دے رہی تھی ــــ! اس نے
مجھے دیکھا تو مسکرا کر کہنے لگی :ــــ

"کہئے جناب کیسے تشریف لائے آپ؟"

میں نے سنبھل سنبھل کر کہا :ــــ

"آپ کو مبارکباد دینے ــــ!"

"اوہ !! شکریہ لیکن کیا آپ نے ہسپتال کا نام نہیں سنا؟"
اس نے پوچھا

"جی نہیں!" میں نے شرارتاً کہا ــــ اور اسکی نگاہوں
میں کچھ ڈھونڈنے لگا لیکن وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آسکی
"آپ کو معلوم ہے اتنا اچھا نام میں نے کہاں سے پایا؟"
وہ بولی۔

"نہیں تو ــــ!" میں نے جواب دیا لیکن اسکی محویت
میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ کہنے لگی :ــــ

"اچھا سنئے۔ میرے بھائی کے ایک دوست تھے ان کا

نام تھا سلمان ــــ میرے بھائی ان کو بہت پیار کرتے تھے۔ اور میں بھی اُن کی کافی عزت کرتی تھی۔ مگر نہ معلوم بیچارے کدھر غائب ہوئے کہ چار پانچ سال سے صورت نہ دکھائی۔ ممکن ہے کہ بھائی صاحب اُن سے ملتے ہوں لیکن میں نے اپنی مصروفیت کی بنا پر ایک عرصہ سے انہیں نہیں دیکھا ــــ بھیّا ہی کے مشورہ سے میں نے اپنے ہسپتال کا یہ نام رکھا ــــ" میرے ہوش و حواس کہاں قائم تھے جو اُس کی باتوں کا کوئی جواب دیتا ــــ اتنے میں باہر سے گھنٹی بجی اور وہ ایک مریض کو دیکھنے چلی گئی ــــ وہاں سے میں چلا آیا۔ غلط فہمی کا تصور ایک دھماکہ کی طرح میری ساری ہستی کو زیر و زبر کر چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے عزیز وطن کو بھی خیرباد کہدیا اور ایک ضلع کے مدرسہ میں استاد ہو گیا ــــ میری آمدنی کا آدھے سے زیادہ حصہ اخباروں و رسائل کی نذر ہو جاتا کیونکہ اُن کے صفحوں پر میں اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرتا تھا۔ ایک دن میں نے اخبار میں دیکھا کہ مخمور کی منگنی ڈاکٹر شیرازی سے ہو گئی میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ــــ میں ــــ ایک غریب اور ذلیل انسان جس کے پاس نہ دل تھا اور نہ دل میں کوئی

تمنا ___ مجھے تو برباد ہی ہونا تھا۔ چند ہفتوں بعد اخبار میں یہ خبر بھی چھپ گئی کہ مخمور کی شادی ہو گئی ___ میں بھی آخر انسان ہوں۔ میرے پہلو میں بھی دل تھا۔ اور دل میں درد تھا کب تک صبر کرتا ___؟ میری شرافت، صبر اور ایثار کا پیمانہ چھلک گیا اور ایک رات میں گھر سے نکل کھڑا ہوا ___ میرا کام گشت لگانا تھا ___ آگے بڑھنا تھا میں بڑھتا جاتا تھا ___ ہمیشہ آگے ہی آگے ___ پر میری حالت اس مسافر کی سی تھی جس کی منزل خود ہی بھٹک گئی ہو ___ اُس دن سے لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے ___ بوڑھے مجھے مجذوب سمجھتے ___ جوان میرا مذاق اڑاتے اور بچے مجھ پر پتھر پھینکتے ___!! آہ! یہ دنیا والوں کو کیا معلوم کہ ایک بیکس و مجبور انسان کے دل میں کتنے ناسور رستے رہتے ہیں ___؟

ایک رات میں بھٹکتا ہوا ایک چمن میں گھس گیا ___ پورے چاند کی رات تھی یکایک کسی کے گانے کی آواز میرے کانوں میں آئی ___ میں ٹھٹکا ___ آج سے پانچ سال پہلے کا سماں میری آنکھوں میں کھنچ گیا ___ یا خدا ___ یہ مخمور ہی تو تھی جو اپنے شوہر کے آگے بیٹھی وہی راگ الاپ رہی تھی جس نے

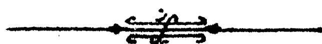
میری زندگی کو پھونک ڈالا تھا۔ آج کی رات اور وہ رات دونوں میں کتنا فرق تھا؟ زمین و آسمان کا فرق ——! اس رات زندگی حسین تھی، زندگی جوان تھی —— زندگی مسکرا رہی تھی —— اور اس رات زندگی سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی —— میرے صبر کا پیمانہ یکایک چھلک پڑا۔ مجھ سے وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ میں دوڑ کر ان دونوں کے سامنے پہونچا اور کہنے لگا —— "بند کرو مخمور!! خدا کے لئے بند کرو اپنا دیپک راگ ——!! تمہارے اس گانے نے ایک معصوم کو دیوانہ بنا دیا۔ اس کی مسرتوں کی دنیا کو خاک میں ملا دیا ہے —— اسکی جوان امنگوں کا گلا گھونٹ ڈالا ہے!

اور نہ جانے میں کیا کیا بک گیا —— مجھے تو اب صرف یہ یاد ہے کہ وہ میرے سامنے تھی اور مجھے حیرت سے آنکھیں پھاڑے تک رہی تھی۔ یکایک میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور شاید میں بے ہوش ہو گیا —— اس کے تیسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو سلطان ہسپتال میں پڑا پایا۔ میری پیشانی پر زخم آیا تھا —— یہ زخم کبھی اچھا نہ ہوا میری حالت وحشیوں سے بدتر تھی —— مجھے کیسے پہچان سکتی تھی وہ!! اس کا نہ پہچاننا میرے لئے اچھا ہی ہوا —— مجھے ہوش

آنے کے ایک گھنٹہ بعد رات کے وقت میں چوری سے بھاگ
نکلا اور پھر وہی آوارہ گردی شروع ہوگئی ـــــ اب کے آپ
مجھے پکڑ لائیں ـــــ میں آپ جیسی خاتون کا احسان عمر بھر نہ
بھولوں گا ـــــ اور سچ تو ہے کہ اسی احسان کی وجہ سے میں
نے اپنے دل کا راز آپ سے کہہ دیا ہے ورنہ میری زندگی کا
[illegible] جاتا ـــــ!!" وہ خاموش ہوگیا۔
اور اس کی نگاہیں [illegible] کچھ ڈھونڈ رہی تھیں!!
میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے [illegible]
تھا اور پھر نہ جانے کیوں دوسری رات اس [illegible] کی حر
یکایک بند ہوگئی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خوابوں کی ازلی
دنیا میں کھو گیا اور جب میں نے اس کی اطلاع مخمور کو دی او
تمام واقعات من وعن سنائے تو مخمور کی آنکھوں سے دو موٹے
موٹے آنسو ٹپک پڑے ـــــ اس نامراد کی حسرتوں اور
نامرادیوں کا اس سے زیادہ کیا صلہ دیا جا سکتا تھا ـــــ؟

دو آنسو ـــــ!!

دو زندگیاں ـــــ!!!



دِل کی کلی نہ کھِل سکی میرے لیئے بہار کیا

اُن کے بغیر آسکے دِل کو میرے قرار کیا!

تیرے بغیر!

نوجوان پڑوسی بڑی پیاری رو (Mood) میں گا رہا تھا۔ اُس کی سُریلی آواز میں نشتر بھرے ہوئے تھے جو شاہدہ کے زخمی دل کو چھلنی کر رہے تھے ـــ داستان کا تازہ پرچہ ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر آ رہا تھا۔ آنکھیں برقی بلب کے اطراف گھومنے والے پروانوں پر ٹھیر گئی تھیں۔ ہونٹ لرز رہے تھے اور روح ساکت جسم میں جدائی کے آتش ریز نغموں سے جھلس رہی تھی ـــ دو سال قبل کے مناظر اُسکی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں رقص کرنے لگے ـــ!

رات کتنی سہانی ہو چلی تھی۔ میگھ راجہ کی اپسرائیں لچکتی ہوئی کمر اور ہلکے ہلکے قدموں سے چھم چھم ناچ رہی تھیں فضاؤں پر روماں کی افشاں بکھر گئی تھی ـــ!

وہ اپنی ہی دھن میں مگن کمرہ میں بیٹھی اپنے تازہ شاہکار میں رنگ بھر رہی تھی کہ اشفاق کمرہ میں داخل ہوا۔ اُس نے رنگوں کی خوبصورت تختی ہاتھوں سے چھین کر پرے پھینک دی اور صوفہ پر نیم دراز ہو کر گنگنانے لگا

"مانا کہ عزمِ ترکِ تمنا کرینگے ہم ــــــ پر
تیرے بغیر جی کے بھلا کیا کرینگے ہم ــــــ ؟!!"

شاہدہ کے شفقی رخساروں پر قوسِ قزح کوندگئی اس نے اپنے شوخ محبوب کو چھیڑنے کی خاطر تصویر اپنے ہاتھوں میں اٹھا لی اور بڑی سنجیدہ صورت بنا کر بولی ــــ

"مگر آپ کو کیا پڑی ہے کہ تمنا کو ترک کرنے کا ارادہ بھی کریں ــــ ؟"

اشفاق کی آنکھیں یکایک ڈبڈبا گئیں اور اُس نے شاہدہ کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ شاہدہ کا دل کسی آنے والی مصیبت سے بری طرح دھڑکنے لگا ــــ اور وہ اشفاق کے قریب آئی ــــ

"کیا بات ہے اشفاق بھائی؟" اسکی آواز میں کپکپی تھی۔ اشفاق نے ایک قہقہہ لگایا اور صوفہ سے اُٹھ گیا۔ وہ

اپنی شاہدہ کو بے چین نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے فوراً اپنا لہجہ بدل دیا ——— "کیوں کس طرح بے وقوف بنایا ہے جناب کو ؟ شاہدہ کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ وہ کب ماننے والی تھی اُس نے مزید پریشانی کے ساتھ کہا ———

"بتائیے بھی ——— ؟ آپ تو ہر بات کو مذاق ہی میں اڑا دیتے ہیں۔ بتائیے نا۔ آپ کو ہماری قسم ہے ——— "

اشفاق نے جب اپنی جان آرزو کی یہ حالت دیکھی تو بے بس سا ہو گیا اور پھر سنبھل سنبھل کر کہنے لگا ———

"تمہارے ابا کے اس وقت جو مہمان ہیں وہ عنقریب تمہارے شوہر ہو جائیں گے۔ اُن کی دولت و حشمت تمہیں مجھ سے بہت جلد چھین لینگی ——— لیکن اس کے بعد میرا کیا ہوگا ——— کس طرح جی سکوں گا ——— شاہدہ میں تمہارے بغیر۔ ؟؟"

شاہدہ بے اختیار پھوٹ پڑی ———

"اشفاق ——— ایسا نہ کہو ——— ہائے اللہ میں لٹ جاؤنگی۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ——— ایسا کبھی نہ ہوگا!!"

اشفاق فوراً اٹھ کر کمرہ سے نکل گیا۔ اپنی شاہدہ کو روتا ہوا چھوڑ کر ——— تڑپتا ہوا چھوڑ کر ——— وہ اتنے کمزور کب

چلا گیا جہاں اس کی کمزوری دیکھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔
فضاؤں پر ابدی سکوت چھا گیا ــــــ اور شاہدہ کی متوالی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو گر پڑے۔
اُس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر دوبارہ اس نے ماضی کے خواب میں اپنے آپ کو گم کر دیا ــــــ اس رات کو ــــــ جیون کی سب سے حسین رات کو اس کی کوٹھی رنگ برنگی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ سرمایہ دار مہمانوں کی چہل پہل سے عجیب ہڑبونگ مچ رہی تھی ـــ عروسی کے سرخ لباس نے اسے جنگلی گلاب بنا دیا تھا۔ بے زبان دلہن اپنی رخصتی سے کچھ ہی دیر پہلے دنیا والوں کی طرف سے منہ پھیر کر قدرت کی ستم ظریفیوں کا گلہ رونے کے لئے کھڑکی میں منہ ڈالی پڑی تھی۔ اس کے چہرہ پر بسنت رُت کی رنگینیاں نہیں خزاں کی اُداسیاں رقصاں تھیں۔ رخساروں پر بغاوت کی زردی چھا رہی تھی۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دل بیکسی کی آگ میں جھُلس رہا تھا لیکن زبان پر لاج اور سماج کا تالا لگا ہوا تھا۔ کھڑکی کے قریب خودرو مہندی کے جھُنڈ میں چھپتا ہوا اشفاق کھڑکی تک پہونچ گیا اور اس نے شاہدہ سے کہا

"کتنا خوبصورت ہے تمہارا لباس شاہدہ !!!"

شاہدہ نے چونک کر اپنے گرم گرم آنسو پونچھ لئے اور طنز سے بولی :——

"ہاں کیوں نہ ہو —— اس میں میری ناکام تمناؤں کا خون جو جذب ہو گیا ہے ——!"

اشفاق تڑپ اٹھا ——

"اب چھوڑو بھی ان ناکام تمناؤں کی باتوں کو شاہدہ —— مجھے تم سے ایک صرف ایک سوال پوچھنا ہے بتاؤ گی نا؟ —— اس نے دھیمے لہجہ میں پوچھا ——

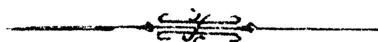
شاہدہ کی آنکھوں نے روپہلی موتیاں بکھیر کر اسے تسلی دیدی۔ اشفاق نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا :

"میں نے تمنا کو ترک کرنے کا عزم ہی نہیں کیا۔ بلکہ میں کبھی کا ترک کر چکا لیکن یہ گتھی سلجھائے نہیں سلجھتی کہ تیرے بغیر۔۔۔۔؟" وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا الفاظ جیسے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے اور پھر وہ مایوس لوٹ آیا۔ سہاگنوں نے شاہدہ کی رنگین نعش کو وہاں سے اٹھالیا اور وہ اپنے دولتمند دولھا کو سونپ دی گئی ——!

اور یکایک شاہدہ نے محسوس کیا کہ وہ تخیلات کی دنیا سے پھر اسی دنیا میں لوٹ آئی ہے ــــ شمیم اُس کے سامنے کھڑا تھا ــــ شمیم اُس کی محویت دیکھ کر ہنس پڑا۔ اُس نے ٹینس کا بلا اُس کے چکراتے ہوئے سر پر رکھ دیا اور جب شاہدہ کے بیکس لبوں پر اس حرکت نے بھی کوئی اثر نہ کیا تو اُس نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا ــــ !

کوئی پڑوسی چیخ چیخ کر گا رہا تھا ــــ درد بھری لے میں ــــ اور شاہدہ کے دل میں اشفاق کی پکار گونج رہی تھی اس کی ناکام تمنائیں گونج رہی تھیں ــــ اسکی برباد آرزوئیں گونج رہی تھیں ــــ اور وہ دل ہی دل میں رو رہی تھی ــــ ہنس رہی تھی ــــ اور ہنستی ہوئی بھی رو رہی تھی ــــ !!

اور شمیم اس کا شوہر اس کے سامنے کھڑا تھا



جل اُٹھا خرمنِ نشاطِ وفا

سوزِ دل کامیاب ہوتا ہے!

عورت کا دل

ایک شاندار موٹر میدان کے پوربی حصہ میں آکر رک گئی کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک نہایت ہی شکیل و جمیل نوجوان اتر پڑا۔ اُس کے جسم پر سفید نیکر اور نیلی جرسی تھی۔ سُرخ و سفید رنگ پر یہ لباس اتنا خوبصورت معلوم دے رہا تھا کہ ہر نگاہ اُدھر کو اُٹھ جاتی۔ نوجوان نے کار کے پچھلے حصہ کا دروازہ کھولا اور وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے اندر کو بیٹھی ہوئی سمٹی سمٹائی لڑکی سے اترنے کیلئے اصرار کرنے لگا۔ یہ اُس کی نئی نویلی دلہن تھی جس کے جسم پہ بیش بہا زیورات اور قیمتی لباس تھا۔ گھنی پلکیں شرم و حیا کے بوجھ سے اُوپر کو نہ اٹھتی تھیں چہرہ پر کم سنی کی سادگی تھی اور اس کے جسم چرانے کا انداز بے حد پیارا

تھا ـــــ کافی اصرار و جبر کے بعد وہ نیچے کو اتر پڑی اور نوجوان نے اس کا رومال لیکر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ لیا! اور ایک دل آویز تبسم کے ساتھ کھیل کے میدان کی طرف چل دیا۔ دولہن بھی لجاتی جھجکتی اس طرف چلی گئی۔ جدھر صرف عورتیں ہی بیٹھی تھیں۔ اپنے نام کی چٹھی پڑھکر وہ ایک مخملی کرسی پر بیٹھ گئی اور شرماتی ہوئی اپنے ارد گرد بیٹھی ہوئی خواتین کو دیکھنے لگی۔ سب کی نظریں اسی کی طرف تھیں اس لئے مجبوراً اسے سرنگوں ہو جانا پڑا۔

میچ شروع ہونے میں مشکل سے پانچ سات منٹ رہ گئے تھے ـــــ اور سب کھلاڑی اپنی جگہ پر جم رہے تھے ـــــ گو رشید کوئی خاص کھلاڑی نہ تھا لیکن اس کی دلچسپ شخصیت نے سارے کھلاڑیوں کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا کہ وہ میدان مار ہی لے گا ـــــ آج وہ بیحد خوش تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر۔ اس کی نئی نویلی پیاری چاندسی دولہن اس کو دیکھ رہی تھی بلکہ اپنی مخمور آنکھوں سے اُس کے سڈول بازوؤں میں نئی جان سی ڈال رہی تھی وہ جان کی بازی لگا کر کھیلنے پر تلا ہوا تھا ـــــ میچ شروع

ہو گیا ـــــ دو منٹ بعد ہی شہناز کے بالکل بازو میں ایک نوجوان لڑکی آکر بیٹھ گئی اور دیوانہ وار کھلاڑیوں کی طرف دیکھنے لگی جیسے اسی کی جان کی بازی لگائی گئی ہو ـــــ حسینہ کے عضو عضو سے بے چینی پھوٹ رہی تھی۔ اسکی بے قراری لمحہ بلمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی ـــــ شہناز نے جب یہ دیکھا کہ وہ دوسری خواتین کے برعکس اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تو وہ اجنبی حسینہ کو بغور دیکھنے لگی۔ سانولی سلونی صورت پر جاذب نظر خطوط اور نگاہوں میں کھبنے والا جسم ـــــ !!

شہناز نے رشید پر نگاہ ڈالی ہی تھی کہ بازو والی حسینہ بے کل سی آواز میں چیخ اٹھی ـــــ "رشید ـــــ !!"

شہناز چونک سی گئی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ حسینہ کی بے قرار نگاہیں اسی کے دولہا کا تعاقب کر رہی ہیں تو اس کے دل کو چوٹ سی لگی۔ رشید بیاٹنگ کر رہا تھا اور اس کا بولر بڑا ماہر کھلاڑی تھا۔ قریب تھا کہ وہ آؤٹ ہو جاتا ـــــ شہناز کا دل دھڑک رہا تھا لیکن نوجوان لڑکی کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ـــــ وہ بڑبڑا رہی تھی ـــــ

"ہائے میرے رشید !! اگر تم واقعی آؤٹ ہو جاتے تو کتنا برا ہوتا ـــــــ ! میں تو شرم سے گڑ ہی جاتی ۔ تم نے ہمیشہ کی طرح میرے رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ بھی پونچھ لیا تھا۔ پھر آج ایسے بے پرواہ کیوں ہوئے جا رہے ہو ـــــــ ؟ خدا کرے کہ جیت تمہاری ہو ـــــــ !!"

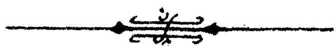
شہناز کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ وہ پسینہ میں شرابور ہوئی جا رہی تھی ـــــــ ہونٹ خشک ہو چلے تھے ۔ اس کا سارا دھیان نوجوان حسینہ کی باتوں کی طرف لگا ہوا تھا اور بے چین آنکھیں بجائے اپنے کھلاڑی کو دیکھنے کے حسینہ کی ایک ایک حرکت کو تک رہی تھیں ـــــــ اور حسینہ کہہ رہی تھی :۔

"میرے پیارے رشید ! میں نے تمہارے مضبوط ہاتھوں کو چوما بھی تو تھا ـــــــ پھر بھی تم ـــــــ ہائے اللہ اب میں کیا کروں !!"

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رشید کے مخالف کھلاڑی نے اُسے رن آؤٹ (Run - out) کر دیا۔ جوں ہی وہ آؤٹ ہوا حسینہ نے ایک دبی ہوئی چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑی ـــــــ

شہناز نے دیکھا کہ حسینہ کا سارا چہرہ پسینہ سے تر ہے، ہونٹ کھلے ہوئے ہیں اور سانس بڑی زور زور سے آ جا رہی ہے ساری خواتین نے حسینہ کو گھیر لیا اور شہناز وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اپنی کار کی طرف چلی گئی ——

دوسری صبح —— شہناز نے اپنے پیارے شوہر کو طلاق دے دی۔ ایک میان میں دو تلواریں رہ بھی سکتی ہیں ——؟؟



کتاب رنگین زندگی کا بنا ہے ہر ایک باب رنگین

ورق ورق پر خیال رنگیں سوال رنگین جواب رنگیں!

زندگی کے کھیل

زندگی میں گلابوں کی رنگینیاں گھل رہی تھیں ــــ امنگوں میں طوفانی ہلچل بپا تھی اور دل ــــ! بیچارہ دل!! ڈانواں ڈول دل تھا!!! بلکہ تھا ہی نہیں ــــ جو کچھ ہو رہا تھا اپنے آپ ہو رہا تھا ــــ! میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ خالہ جان کے ہاں بھی چند دن رہ آؤں۔ کتنی بار انہوں نے چھٹیاں گزارنے کی دعوت دی ــــ کبھی تو میں موقعہ نہ نکال سکی۔ لیکن اس دفعہ ضرور ان کی خواہش پوری کرنے کا ارادہ لئے میں خالہ جان کے یہاں جانے کے لئے تیار ہو گئی ــــ اور چلی گئی!ــ

خالہ جان کی شاندار کوٹھی پر پہونچی تو انہیں اپنا منتظر پایا۔ اُنہوں نے آگے بڑھکر مجھے پھول پہنایا اور گلے لگا لیا ــ میں وہاں سے اُن کے ساتھ کوٹھی کے معائنہ کو نکلی ــــ یا اللہ ــ!

ایک نہ دو، پورے سات کمرے میرے لئے!!؟ ——— کتنا ہی اچھا ہوتا جو میں کلاس کی ساری لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے آتی۔ ایسی پُرفضا جگہ پر اکیلا پن کھائے جاتا تھا ——— میں تو جیسے کھو سی گئی ———

چھوٹا سا زینہ عبور کرتے ہی ایک ننھا سا برآمدہ تھا جسے پھولوں کے گملوں سے سجایا گیا تھا۔ اُس کے وسط میں ایک میز رکھی تھی جس پر کام دیو کا خوشنما مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ ویسے تو سنگ مرمر کی ہر چیز مجھے پسند ہے اور پھر یہ مجسمہ تو بس غضب کا تھا ——— میری نظر اس پر پڑی نہیں کہ میں مسکرا پڑی لیکن ساتھ ہی ساتھ میرا دل دھڑکنے لگا ——— ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پہلے دروازہ پر پہونچی۔ پہلا کمرہ ہلکے سبز رنگ کا تھا۔ یہ ملاقاتی کمرہ جس کی ہر شئے زمردیں تھی۔ دروازوں کے پردے، برقی پنکھے، برقی قمقمے اور ان کے شیڈز، صوفہ سٹ، میزیں، گلدان، تصاویر ——— غرض ہر چیز ساون سماتی ہوئی ——— ! اس کے بعد دوسرا دروازہ کھولا جو سچ تھا ——— بالکل یاقوتی! یہ میرا کمرۂ مطالعہ تھا۔ میز پر رکھی ہوئی چور بازار، نکتہ چیں ہے غم دل، اور گورکی کی مدر جیسی

کتابوں کی جلدیں تک سُرخ تھیں ـــــــ!

تیسرا کمرہ موسیقی کا تھا جس کی ہر چیز نارنجی فضا میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پیانو، ستار، سارنگی، وائلن اقسام کے ساز رکھے ہوئے تھے ـــــــ

چوتھا کمرہ نیلے رنگ میں رنگا ہوا تھا اور یہ میری خوابگاہ تھی ـــــــ! یہ کمرہ مجھے خاص طور سے بہت پسند آیا مسہری پر نیلے رنگ کا بنارسی مچھردان پڑا تھا۔ اس پر باریک سی روپہری گوٹ، بستر نیلے اطلس کا ـــــــ نہایت خوبصورت!! پلنگ کی ایک جانب چھوٹا سا میز جس پر لیمپ رکھا تھا۔ اور اس کے برابر ایک پتلا اور ننھا سا گلدان جس میں رات کی رانی اور شبو کی دمیدہ کلیاں رکھی ہوئی تھیں مینٹل پیس پر ایک چھوٹا سا ٹائم پیس تھا جس کے ہندسے ریڈیم کے تھے کمرہ کی دیوار پہ چینی آرٹ کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی جس میں ایک الف لیلا کی شہزادی کو عالم خواب میں دکھایا گیا تھا اور جس کے نیچے لکھا تھا ـــــــ "مرادوں کی راتیں"

پانچواں کمرہ سنگھار کا کمرہ تھا جو ہلکے بنفشی رنگ میں رنگوایا گیا تھا۔ سنگھار میز، کرسیاں، الماریاں، کنگھی،

برش، تیل، سینٹ کی بوتلیں ـــــ ہر چیز بنفشی فضا میں ڈوبی تھی ـــــ

چھٹا کمرہ غسل خانہ تھا۔ یہ بالکل سفید تھا۔ چینی کے ٹب، آئینے، صابن دان، تولی، ہر چیز دودھ اور چاندنی کی طرح سفید نظر آ رہی تھی۔ نزاکت کی حد کر دی کہ حمام کے کمرہ میں تنگ کھڑکی اور اس میں ایک سفید گلدان جس میں سفید گلاب اور للّی کے علاوہ کنول کے پھول سجائے گئے تھے اور ساتواں و آخری کمرہ، کمرۂ خاص تھا جو قرمزی فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کمرہ کا ساز و سامان بہت ہی بڑھیا تھا۔ ان کمروں کے بعد ایک چھوٹا سا بیرنگ ورانڈہ تھا جو پھول دار بیلوں سے بالکل ڈھکا ہوا تھا۔ چنبیلی، جوہی ـ بوگن ویلیا ـ موتیا ـ بیلا ـ نسترن، نرگس اور گلاب کنج کنج پھیلے ہوئے۔ مہک رہے تھے ـ پھولوں اور خوشیوں کے اس ہجوم میں میرا جی چاہا کہ میں رقص کرنے لگوں ـــــ!

خالہ جان کے سلیقہ اور ذوق کا کیا کہنا ـــ مجھ پر تو انہوں نے جادو سا کر ڈالا۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچنے لگتی کہ کہیں میں الف لیلیٰ کی شہزادی تو نہیں بنا دی گئی ہوں ـــــ؟

میرے خالہ زاد بھائی حسن کشمیر گئے ہوئے تھے۔ انہیں میں نے کوئی بارہ یا چودہ سال سے نہیں دیکھا تھا۔ میرے بچپن ہی میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجدیئے گئے تھے جہاں انہوں نے مختلف اسناد کی حصولی میں دس سال گزارے۔ انہیں ہندوستان آئے کوئی بارہ چودہ مہینوں کا عرصہ ہو رہا تھا لیکن تعلیمی مصروفیت نے مجھے اسکی اجازت ہی نہیں دی کہ میں کبھی ان کے وطن لاہور ہو آتی اور نہ ہی حسن بھیا کو اپنی سیر و تفریح اور جاگیر کے انتظامات سے اتنی فرصت ملی کہ وہ کبھی ہمارے حیدرآباد آتے ——!!

دوسرے دن میں سنگھار سے فارغ ہو کر ناشتہ کے لئے خالہ جان کے ہاں پہونچی تو ٹھٹک کر رہ گئی —— وہاں ان کے علاوہ ایک اور آدمی بھی تھا۔ گورا رنگ۔ سیاہ کپڑے۔ خالہ جان کے زانو پر سر رکھے —— وہ اس کے سیاہ چمکیلے اور چھلے دار بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں اور میں چپکے سے لوٹ گئی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا حسن بھیا ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی وہ اس قدر جلد کیونکر آگئے ؟ میں نے ڈرتے ڈرتے

خانساماں سے اُن کے مزاج کے متعلق دریافت کیا تو اس نے سنایا بہت ہی غصہ والے چڑچڑے قسم کے لڑکے ہیں۔ ہر کس و ناکس سے الجھ پڑنا ان کے خمیر میں داخل ہے میں گھبرا سی گئی مگر پھر خالہ جان کی نظرِ عنایت کے ہوتے ہوئے کیا مجال ہے کہ مجھے تیوری پر بل ڈال کر دیکھ بھی لیں ——؟

میں زینہ سے اتر کر کوٹھی کے چمن میں آئی اور سنگ مرمر کی کوچ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ یہ حسن بھی کتنا خوش نصیب لڑکا ہے؟ پریوں جیسی شکل اور شہزادوں جیسی زندگی۔ دکھ اور سکھ میں تو کبھی اس نے فرق پایا ہی نہ ہوگا —— مگر پریوں جیسی شکل پر میں نے غور کرنا شروع کر دیا بھلا مجھے کیا یقین کہ یہ واقعی خوبصورت ہیں؟ ویسے میں کئی لوگوں سے اُس کے حسن کی تعریف سُن چکی تھی لیکن تقریباً بارہ یا چودہ سال سے میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔ جب میں چھوٹی سی تھی۔ کوئی چار یا پانچ سال کی تو یہاں آئی تھی ایک گورا چٹا لڑکا جس کے بال اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ میرے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور اس کی ستوان ناک پر پسینہ کے چند قطرے ہمیشہ رہا کرتے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی

ہنسی آگئی اور میں سوچنے لگی ـــــ پھر تو حسن بھیا بڑے غصیلے ہو نگے !! اتنے میں میری نظریں اٹھیں۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹا اور بدحواسی کا دورہ شروع ہونے لگا۔ میں نے ڈھلکتی ہوئی اوڑھنی کو سنبھالا۔ چہرہ کے ارد گرد کی لٹوں کو سلجھایا۔ میرے ہوش گم ہو رہے تھے اور جسم میں کپکپی سی محسوس ہو رہی تھی۔ خالہ جان صاحبہ اور ان کے اکلوتے حسین صاحبزادے میری جانب آرہے تھے۔

اب میں نے حسن کو اچھی طرح دیکھا ـــــ !!

ایک چھ فٹ کا لمبا تڑنگا سا لڑکا ـــــ چوڑا سینہ، ورزشی جسم، تیکھے نقوش، گورا رنگ اور متبسم چہرہ ـــ میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی ـــ وہ نیچی نگاہ کئے کمان جیسے ابرو میں مبہم سا بل ڈالے خراماں خراماں چلا آرہا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اسے جبراً لایا جا رہا ہے وہ دونوں میرے قریب آگئے مگر کیا مجال کہ اس نے ایک دفعہ بھی نظر اٹھا کر مجھے دیکھا ہو، میں اسی انتظار میں تھی کہ یہ اب دیکھتا ہے اور جب۔! مگر اس نے اپنی بھونرا جیسی نگاہیں اٹھائی ہی نہیں ـــ

خیر تو خالہ جان نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ میرا تعارف اُس سے یوں کروایا ـــــ
" یہ تمہاری خالہ زاد بہن سمینہ ہے جو اس سال بی اے کا امتحان دے چکی ہے ۔ بچپن میں تمہاری ہر شرارت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والی گڑیا ــــ مگر کان کھول کر سن لو ۔ اب اس کی باری ہے ـــ سمجھے ؟؟"
اتنا کہہ کر خالہ جان نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا ـــــ
میں نے بہت ہی ادب سے حسن کو سلام کیا ۔ لیکن اس نے میرے تعظیمی سلام کا جواب ایسا دیا جیسے کوئی چہرہ سے مکھی اڑاتا ہو ـــــ میں جل ہی تو گئی ـــ!!
وہ پیچھے ہاتھ باندھے اپنی ایڑیوں پر جھومتا جاتا تھا اور باغ کے ہر ذرہ کا معائنہ کر رہا تھا ۔ کبھی کبھی اپنی والدہ سے پودوں کے متعلق کچھ کچھ دریافت بھی کرتا جاتا تھا ۔ کچھ دیر بعد وہ لاپرواہی سے آگے بڑھا اور بڑھتا ہی گیا ـــــ
مارے ندامت کے میں سرخ ہو گئی ۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میں بھی اپنے کمرہ کا رخ کر رہی تھی کہ خالہ جان نے آواز دی ـــــ " بیٹی چلو پہلے ناشتہ کر لیں ـــ!"

اور میں مجبوراً ان کے ساتھ کمرۂ طعام میں پہونچی — وہ بھی آگئے۔ میز کی ایک جانب میں اور خالہ جان تھیں اور وہ ہمارے مقابل! رنج و غم سے لقمہ میرے حلق میں اٹک رہا تھا — میں نے بڑی جلدی سے ناشتہ ختم کیا اور اُٹھ گئی — شاید خالہ جان نے میری اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ حسن کی بدتمیزی پر ہلکی سی ڈانٹ بتائی گئی —!

اُس حسین شام کو میں صوفہ پر نیم دراز ایک ناول پڑھتی لیٹی تھی — بھاری قدموں کی آواز سُن کر میں چونک پڑی —

اوف یہ کون ہوگا؟ پھر سیٹی کی آواز آنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے دروازہ کا پردہ ہٹا بغیر کچھ کہے وہ کمرے میں داخل ہوگئے۔ لیکن مجھ کو دیکھے بغیر تیز لہجہ میں اس طرح کہنے لگے جیسے بچے دو کا پہاڑا سناتے ہیں —

"آپ کی تشریف آوری سے مجھے دلی خوشی ہوئی۔ میں دلی طور پر مشکور ہوں۔ آپ نے اتنی زحمت فرما کر ہمارے غریب خانے کو روشن فرمایا — دلی شکریہ —!!"

اور وہ واپس ہوگیا — ارے یہ کیا —؟ میں

حیران رہ گئی۔ دلی خوشی ــــ دلی مشکور ــــ دلی شکریہ!
کیا یہ وہی حسن بھیا ہیں جو بچپن میں مجھ سے گھنٹوں کھیلا کرتے تھے۔ میری گڑیا سے اپنے گڈے کا بیاہ رچاتے تھے؟
شام میں جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ٹینس کھیلنے کلب جا چکے ہیں تو میں اپنے کمرہ سے باہر نکلی خالہ جان کے پاس پہونچی۔ او وہ ایم۔ اسلم کا کوئی ناول پڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہہ اُٹھیں ــــ
"آؤ بیٹی!! تم نے دوپہر کو کچھ بھی نہیں کھایا۔ تمہاری وجہ سے حسن نے بھی نہیں کھایا۔ ابھی ابھی باہر گیا ہے کچھ دیر پہلے تم آتیں تو اس کے ساتھ سیر کو جا سکتی تھیں! وہ تمہاری ہزاروں تعریفیں کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ۔
خدا جانے وہ کیا کیا کہہ رہی تھیں ــــ میرا سر تو چکرا رہا تھا ــــ تعریفیں میری؟! ــــ میری وجہ سے کھانا نہیں کھایا ــــ؟ غلط بالکل غلط ــــ کس قدر مبالغہ اور غلط بیانی کر رہی تھیں وہ ــــ! بلکہ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہی تھیں۔ مجھے خاموش اور اُداس دیکھ کر کہنے لگیں: ــــ

"کیوں بیٹی! تم اس قدر اداس کیوں ہو ——؟ کل جب آئی تھیں تو بہت مسرور تھیں مگر آج صبح سے تمہیں ہو کیا گیا ہے ——؟"

میں نے موقعہ غنیمت جان کر کہا:——

"مجھے کل رات ہی سے اختلاج قلب کا دورہ پڑ رہا ہے۔ خالہ جان —— میں نے بہت صبر کیا لیکن اب ضبط ناممکن ہے۔ مجھے امّی کے پاس بھیج دیجئے۔ میں ہوائی جہاز سے چلی جاؤنگی ——بہت جلد ——!"

خالہ جان میرے ارادہ کو سُن کر متحیر ہو گئیں پھر اُنہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب تاڑ گئیں کہ میں اپنی دھن کی پکی ہوں تو بہت ہی التجا اور منت سماجت کر کے ڈاکٹر کو بلوایا

—— میرے اللہ —— ! اب میں کیا کروں ——؟" میرے منہ سے نکل ہی گیا —— خالہ جان میری رنجیدگی کی وجہ خوب سمجھتی تھیں۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو صوفہ پر ڈال دیا اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ سیاہی بڑھتی گئی یہاں تک کہ بالکل گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا میں اس اندھیرے میں سما گئی جب

آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ میں اپنے کمرۂ خواب میں تھی۔ کمرہ کے باہر خالہ جان، ڈاکٹر اور نرس کھڑے آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ شاید میں نے کچھ دیر بعد پھر سے آنکھیں کھولیں تو۔ ایک مضبوط ہاتھ اپنے بالوں میں الجھا ہوا پایا۔ میں نے ہمت کر کے اپنی نیم وا آنکھیں اوپر کیں۔۔۔ دو غزالی آنکھیں جن میں آنسوؤں کے ساگر موجیں مار رہے تھے۔ مایوسانہ طور سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میری اور ان کی آنکھیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ میری آنکھوں میں جیت اور خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں شکست اور شرمندگی کے سمندر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔۔۔ انہوں نے اسے تھام لیا۔ بجلیاں دوڑ گئیں۔ وہ لپک کر میرے قریب آ گئے۔ میں سمٹ گئی اور دوسری جانب منہ پھیر لیا۔ وہ رک رک کر کہنے لگے:۔۔۔

"مجھے معاف کر دو سمینہ!! میں نے تمہارا دل دکھایا ہے میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ کھیل کھیل میں روٹھ گئیں؟"

۔۔۔آہ! میں کیا سن رہی تھی !! خوشی سے میرا حال برا تھا۔ خودداری نے محسن کے آگے سر ٹیک دیا نا؟ ۔۔۔

غرور کو شکست ہوئی تھی۔ میں نے فتح حاصل کی۔ آخر ان کا سر آج میرے سامنے جھک ہی گیا۔ انہیں یوں آبدیدہ دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب یوں ہی روتے رہے۔ خوشی کے موتی لٹاتے رہے ـــــ نچھاور کرتے رہے ـــــ!

دوسری صبح میں نے سنگھار کیا اور یوں ہی کچھ گنگنا رہی تھی۔ کہ حسن آپہونچے۔ رکتے رکتے انہوں نے کہا: ـــــ

"سمینہ ـــ چلئے سیر کا وقت ہوگیا ہے۔ گھوڑے تیار ہیں۔!

میں ان کے ساتھ ہولی۔ اس طرح سیر و تفریح میں ایک مہینہ گذر گیا۔ میری زندگی پر حسن چھا گیا تھا اور میں اس کی محبت میں ڈوب گئی تھی۔ ہر وقت اسی کا تصور ـــــ یہاں تک کہ خوابوں کی دنیا میں بھی وہ مجھ سے جدا نہ ہوتا تھا۔ میں کسی کو پاکر خود کو گم کر چکی تھی ـــــ اور ـــــ خوش تھی ـــــ بے حد خوش!!

ـــــ ایک رات ـــــ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے اطراف و اکناف کے تمام پھولوں کے تختے مہک رہے تھے۔ فضا معطر تھی ـــــ اور کائنات پر رومان سا چھا گیا تھا ـــــ! خالہ جان اپنی سہیلی کے یہاں گئی ہوئی تھیں اور حسن تفریح کے لئے نکل پڑے۔ خالہ اور

ان کی سہیلی باغ کی کوچ پر بیٹھ گئیں اور باتیں ہونے لگیں۔ اپنے زمانہ کی دلفریب باتیں ——! حسن نے مجھے اشارہ کیا —— میں وہاں سے اُٹھ گئی اور ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے باغ کے درمیان پہونچ گئے جہاں ایک بہت عمیق کنواں تھا۔ ہم اُس کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ میں نے شرارتاً کہا —— "اچھا حسن! اگر تمہاری ثمینہ اس کنویں میں گر جائے تو —— ؟" اوس نے بھی شرارت آمیز انداز میں کہا —— "تو تالیاں بجاؤں گا میں ؟" میں کھل کھلا کر ہنس پڑی —— پھر بولی ——

"مذاق نہیں حسن ؟ سچ بتاؤ —— اگر میں اس کنویں میں گر کر مر گئی تو تم میرے لئے ایک تاج محل بناؤ گے نا —— ؟"

اُس نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا اور وہاں سے اُٹھ کر چل دیا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اسے واپس بلالوں لیکن وہ رکائے نہ رکا —— میں حیران بھی تھی کہ ایسا کیوں —— ؟ اور جی ہی جی میں کڑھنے لگی کہ اچھی بھلی شام کا ستیاناس کر ڈالا۔

صبح جب میں اپنے ناخنوں کو پالش کر رہی تھی تو ملازم میرے نام ایک ٹیلیگرام لایا —— میری کامیابی کی خوشخبری تھی۔ میں اس خوشی میں دیوانی سی ہو گئی اپنے آپ کو آئینہ

میں دیکھا ـــ واقعی گریجویٹ کی سی آن بان مجھ میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر جدھر نگاہ اٹھاتی تھی ہر شئے پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ "سمینہ بی اے ـ سمینہ بی اے!!" یکایک خیال آیا کہ یہ خبر سب سے پہلے حسن کو سنانی چاہئے مگر فوراً ہی رات کا واقعہ یاد آگیا۔ ملازم سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ابھی سو رہے ہیں۔ مجھے تشویش ہوئی تار لیکر سیدھی اُس کے کمرہ تک جا پہونچی دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن پردہ پڑا تھا۔ میں نے آہستہ سے اندر جھانکا۔ بغیر آستین کا سفید بنیان اس کے جسم پر خوب کھل رہا تھا۔ چھلے دار سیاہ چمکیلے بال بڑی بے ترتیبی سے اسکی کندنی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ سگریٹ اس کے لبوں میں دبا ہوا تھا میں نے تار باہر رکھ دیا اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"حسن! ـــ میں اندر آؤں؟" اُس نے فوراً جواب دیا۔

"جی نہیں۔!" میں ٹھٹکی مگر پھر مجھے خیال آیا کہ وہ تو روٹھا ہوا ہے۔ میں ہنستی ہوئی اندر چلی گئی ـــ اور اس کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور کہا:ـ

"حسن میں نے تمہیں بہت دکھ دیا ہے۔ مجھے معاف کردو کھیل کھیل میں روٹھ گئے تم ـــ! تمہاری محبت کو آزمانے کیلئے

میں نے ایسے جملے کہے تھے اور مجھے یہ سنکر واقعی بے حد خوشی ہوئی کہ تم مذاق میں بھی میری جدائی گوارا نہیں کر سکتے!" وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت تیر رہی تھی۔ کہنے لگا۔ "سمینہ! میری کنول رانی!! تم نے بھی اصلی واقعہ کو سمجھا ہی نہیں۔ بات در اصل یہ تھی کہ ــــ آہ کیسے کہوں ــــ؟" وہ اتنا کہہ کر اٹھ بیٹھا ــ میں لپک کر اس کے اور بھی قریب ہو گئی ــ

"تو تم اور کچھ کہنا چاہتے ہو حسن؟ کہو ــــ جلدی کہو میرے ہوش و حواس اُڑے جا رہے ہیں۔ میرے خدا میں کیا سننے والی ہوں ــ؟؟"

وہ سنبھل کر بولا ــــ "امی نے تمہارے ابا کو خط لکھا تھا۔ جانتی ہو کس لئے ــــ؟" وہ اتنا کہہ کر مسکرا دیا اور میں دم بخود حسن کو گھور رہی تھی ــ میرا سر چکرانے لگا ــ وہ بولا ــــ

"ہمارے، اپنے بیاہ کے لئے!"

اب میں بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن حسن نے مجھے زبردستی روک لیا۔ پھر بھی میں وہاں سے بھاگ ہی نکلی اور اپنے

کمرہ میں آکر اپنے آپ کو صوفہ پر گرا دیا اور تکیہ میں منہ چھپا لیا۔
مسرت کی لہریں میرے جسم میں دوڑنے لگیں اور پھر ابّا کا
خیال آگیا ـــــ انہوں نے کیا جواب دیا ہوگا؟ ـــــ میں سوچ
رہی تھی کہ وہ بھی مخملی کوٹ پہنے اندر داخل ہوا اور میرے
پہلو میں بیٹھ گیا ـــــ میں بدستور تکیہ اپنے چہرہ پر رکھی ہوئی
تھی وہ قدرے غم زدہ لہجہ میں کہنے لگا: ـــــ
"ہاں تو تمہارے ابا نے یہ جواب دیا کہ جب تک تم
بی اے نہ کرلو وہ تمہارا بیاہ ہرگز نہ کرینگے ـــــ!"
اس جواب کو سن کر میری ڈھارس بندھی اور میں نے
اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن حسن کے خوبصورت چہرہ پر
ناامیدی اور یاس کے آثار باقی ہی تھے۔ وہ کہنے لگا:۔
"اس جواب کو سن کر میں نے یونیورسٹی کو تار کیا۔ لیکن
سمینہ جانتی ہو مجھے اس منحوس تار کا کیا جواب ملا؟ تمہاری
صدر مس شیریں نے جواب دیا ہے کہ سمینہ اس سال ناکام
رہی ہے۔ اور سمینہ! میرے پیروں تلے زمین ہٹ گئی۔
ایک سال اور انتظار کروں؟ اُف میرے معبود!! اور پھر
خدا جانے اور کتنے سال مجھے انتظار کرنا پڑے گا ـــــ؟

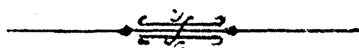
اس واقعہ پر میں اور امی بہت رنجیدہ ہوئے اور اسی غم و غصہ کو دبانے کے لئے ہی ہم نے کل رات سیر کا پروگرام بنایا تھا جہاں تم نے میرے غم کو دوبالا کر دیا ——— !

میں جانتا تھا کہ تم مذاق کر رہی ہو اور محض مجھے چھیڑنے کے لئے ایسا کہہ رہی ہو مگر میرا خیال کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ میں نے اسی میں خیر سمجھی کہ تم سے جدا ہو جاؤں تاکہ مجھ سے کسی قسم کی بھی ایسی ویسی حرکت سرزد نہ ہو جائے یہاں آکر میں رات بھر یہی سوچتا رہا کہ چند ہی ہفتوں میں تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گی اور نہ جانے کتنے سال مجھے تمہارے انتظار میں تڑپتے گزارنا ہوگا ——— خیالات سلجھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی اختر شماری میں پہروں گذر گئے ——— کتنے تارے ٹوٹے ——— کتنے مدھم ہوئے اور کتنے ہی ماند پڑ گئے !" حسن کی آواز گلوگیر ہو گئی اور اس نے سر جھکا لیا ——— اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے لرز رہے تھے۔ میں نے اُسے یوں اداس دیکھا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے اپنی کامیابی کا تار آہستہ سے اس کے ہاتھ میں دیدیا۔

اس نے بغور پڑھا اور خوشی کے مارے وہ چیخ اٹھا۔
"تو کیا وہ میرا تار جھوٹا تھا ؟ خدا کرے ایسا ہی ہو!!" وہ بھاگتا ہوا گیا اور تھوڑی دیر میں وہ تار لے آیا جو اس کے تار کا جواب تھا۔ میں نے اس سے تار کو چھین کر پڑھا اور سارا واقعہ بھانپ گئی اور میں بے اختیار ہنس پڑی — ! حسن نے حیرت سے پوچھا —
"ہنستی ہو ؟ لیکن کیوں — ؟؟" میں نے تفصیل بتائی — "ہماری پرنسپل مس شیریں بنگلور گئی ہوئی ہیں اور آپ کا تار اقامت خانہ میں رہنے والی میری عزیز اور راز دار سہیلی مس شیریں کو ملا اور جب اس نے دیکھا کہ تار حسن کی جانب سے ہے تو اس کی شریر طبیعت نے زور مارا اور یہ جولانی دکھائی — !!"
وہ خوشی سے اچھل پڑا اور مسکراتے ہوئے بولا : —
"خوب — ! سالی بننے سے پہلے ہی مذاق

شروع کر دیا؟"——

اور میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی——
اُس سنہری صبح زندگی بے حد حسین تھی!!!



کمالِ ضبط کہوں یا کمالِ مایوسی

فغاں کجا کہ مرے لب پہ اب دُعا بھی نہیں!

تم

آج میں تمہیں بہت سی باتیں سنانا چاہتا ہوں شاید
تم نے انہیں بھلا دیا ہو لیکن اب میں صرف انہی کے سہارے
زندہ ہوں۔ بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ ایک
ہم خیال کی آواز میرے دل کی دھڑکنوں پر چھا گئی میں
جو اپنی تنہا بھٹکتی ہوئی روح کے لئے کسی ساتھی کی تلاش
میں تھا وہ تلاش تمہارے قدموں میں تھک کر آسودہ
ہو گئی ـــــ یہ ہوا بہت پہلے اور میں نے کسی سے نہ کہا۔
تم سے بھی نہیں کیونکہ میری کامیابی کسی ملک پر فتح نہ تھی
جو میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتا ـــــ کوئی کارنامہ نہ تھا جس کا
اظہار کرتا ـــــ ایک مسافر ـــــ پیاسا مسافر ـــــ زندگی کے
راستہ پر تنہا بھٹک رہا تھا ـــــ اسے ایک چشمہ پر

سیرابی نصیب ہوئی اور وہ آگے بڑھ گیا ـــــ اب نہ اُسے اپنی پیاس یاد ہے اور نہ چشمہ کی سیرابی ـــــ اُسے تو ایک جز کی کمی سی محسوس ہوئی تھی اور وہ پوری ہو گئی تھی!!

سرما کی تعطیلات کا یہ مہینہ کس طرح گذرا ہے یہ نہ پوچھو لیکن اس طویل مدت کا وہ کونسا لمحہ ہے جو تمہاری یاد سے خالی ہو۔ کونسی رات تم نے میرے خوابوں کی سلطنت میں ملکہ کی حیثیت سے حکومت نہیں کی ـــــ میں نہیں جانتا کہ میں تم سے اتنی محبت کیسے کرنے لگا ہوں۔ مجھے جب کبھی اس عشق کا احساس ہوتا ہے تو میں کانپ اٹھتا ہوں لیکن نہ جانے کیوں میں اب محسوس کرنے لگا ہوں۔ جیسے ایک سہانی بلندی پر سے نیچے ڈھکیل دیا گیا ہوں اور ہزاروں زینوں پر سے لڑھکتا لڑھکتا ناکامیوں کی اندوہ ناکیوں میں جا پڑا ہوں ـــــ!! ایسے خیالات مجھے اکثر تڑپاتے رہتے ہیں ـــــ!

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، جب ہم حیوانیات عملی کے لئے یونیورسٹی جا رہے تھے۔ جگنو اپنی مقابل میں بیٹھی ہوئی نفیس کو دیوانہ وار دیکھ رہا تھا۔ بھری ہوئی

موٹربس کی نظروں سے بے خبر ہو کر ــــ تم نے مجھے اشارہ کیا اور دوسرے لمحہ تم مسکرا رہی تھیں ــــ وہ مسکراہٹ جو میرے دل کی گہرائیوں میں اب تک بسی ہوئی ہے ــــ اور میں ــــ بے اختیار ہنس پڑا ــــ جگنو کی بے خودی پر یا اپنی دیوانگی پر ــــ مجھے معلوم نہیں ــــ لیکن اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس وقت جگنو کی نگاہوں میں آخر کونسا جذبہ پنہا تھا ــــ؟ میری حالت اب جگنو سے زیادہ بدتر ہے ــــ میرے دل کے ساتھ ہمیشہ ظالمانہ سلوک ہوا ہے لیکن مجھے یہ طمانیت حاصل ہے کہ تم میری وجہ دکھی نہ ہو سکیں اور جس طوفان کی گھن گرج تمہارے کانوں تک پہنچی تھی۔ اس کی زد سے تم ہٹ گئیں ــــ ہر حقیقت تلخ ہوتی ہے؟ اس ہجر و جدائی کی بدولت، جس سے دنیا کے سارے عشاق نالاں ہیں مجھے اپنی حقیقت کا پتہ چلا ورنہ مجھے اس کا علم ہرگز نہ ہوتا کہ جب میں تم سے ــــ یک لخت ــــ فاصل کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتا ــــ تو میری کیا حالت ہوتی! لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم مجھے بھول جاؤ گی۔ نظروں سے دور ہوتے ہی میں تمہارے

نازک خیالوں سے بھی نکل جاؤں گا۔ تم ہی پر کیا موقوف ہے یہ ساری دنیا کا دستور ہے۔ یہاں لوگ اپنی سی کرکے رہتے ہیں۔ ایک دلی اور روحانی وابستگی، جہاں بے لوث جذبات کی فضا میں کچھ دیر بہکنے اور بھٹکنے کو ہوئی کہ ظالم صیاد کا ہاتھ اس پر پڑتا ہے اور خلوص و محبت کی یہ نئی نویلی، نوخیز اور نازک کلیاں بڑی بے دردی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسل دی جاتی ہیں! یہ دنیا ستم ظریف ہے اور ستم ظریفی ہی اس کا پرانا وطیرہ ہے۔ سب کے دل اس کی سفاکیوں کی زد میں آتے ہیں۔ اس کے بے درد پنجوں سے کوئی نہ بچ سکا ——! کالج کی چار سالہ زندگی کے بعد تم کہاں اور میں کہاں ——؟ منزل ایک ہی پر راستے تو جدا ہو گئے —— ہمیں ان کٹھن اور صبر آزما راستوں کو عبور کرنا ہی پڑے گا —— اور پھر یہی نہیں بلکہ —— بلکہ کسی کی دل جوئی بھی کرنی ہوگی —— اس وقت کیا تمہیں میری یاد کے لئے ایک لمحہ —— ایک —— صرف ایک حقیر سا لمحہ مل سکے گا ——؟ مجھے اس کا بھی تو یقین نہیں اور میرا حال!! کیا کرو گی میرا حال پوچھ کر —— میری زندگی

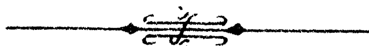
پتھر کی مانند بے حس ہو جائے گی۔ جب تک کسی دل میں تمنا کا گزر رہتا ہے۔ اس کی دھڑکن جاری رہتی ہے ــــ مگر جیسے ہی ارمانوں آشاؤں اور تمناؤں کا خون ہوا، دل کا دھڑکنا بھی بند ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ نہ کچھ پانے کی خوشی اور نہ کچھ کھونے کا غم ــــ! ایسی حالت میں زندگی پتھر ہی تو بن جائے گی۔ پھر مجھے تمہارے رسیلے نینوں کے سوا کچھ بھی یاد نہ ہوگا۔ ہرن جو تم سے نگاہیں چار کرتے ہی اپنی آنکھیں جھپک سی لیتی تھی۔ مایوسی اور شکست کے باوجود میگوں آنکھوں میں خوشی کے قطرہ ہائے اشک چھلک جاتے تھے شاعر کہتا ہے: ــــ

"برس پڑتی ہیں آنکھیں جب تصور باندھ لیتے ہیں
نہ بھولیں گی تمہاری مست چشم سرمگیں برسوں!"

اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے میرے دل کی بات کہی ہے جب ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہروں بیٹھا کرتے۔ شب و روز عیش و عشرت کے نشاط انگیز نغمے گاتے تو اپنے آپ کو سب سے خوش نصیب سمجھتے۔ اور یہی نغمے، روح کو طمانیت دماغ کو سکون اور دل کو فرحت بخشتے۔ ہماری طرب انگیز

دنیا میں کسی غیر کی آواز کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہ تھا۔ مگر وہ سب ایک خواب ہی تو تھا جسے ہم جاگتے میں دیکھ رہے تھے "ہاں خواب سے زیادہ اُس کی حقیقت ہی کیا ہے!!
تم لکھتی ہو کہ تمہیں میرے خونِ جگر سے لکھے ہوئے خطوط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے اور مجھے تمہارے پیارے پیارے ہاتھوں کی چند سطور پڑھنے سے کیا ملتا ہے — یہ نہ پوچھو۔ میں اپنے دل کی لرزشوں کو تھام تھام کر ایک سطر —— اور پھر دوسری سطر پڑھتا ہوں۔ اور جب اُس مقام پر پہنچا ہوں جہاں تم اپنے فیصلوں کا اظہار کرتی ہو —— تو —— میری رُوح کے تار تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ سب ہنستے ہیں اور میں دل ہی دل میں روتا ہوں۔ ان آنسوؤں کی تکلیف کو تم کیا جانو جو آنکھوں ہی میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جو ڈھلکنے بھی نہیں پاتے ——!! میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے اور دل زخموں سے چور ہوتے ہیں۔ میں اپنی مجبوریوں اور مایوسیوں کے ہجوم میں رد بھی تو نہیں سکا۔ مجھے کبھی موقعہ ملا ہی نہیں کہ میں تمہیں اپنی زندگی کا کچھ خونچکاں پہلو دکھاتا —— میری زندگی ایک پریشاں

خواب ہے جسے نیند ہی نصیب نہیں ہوتی ــــ!
کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو زبان یا قلم کے ذریعہ ظاہر تو ہو جاتی ہیں پر دل کہتا ہے وہ تو مجھ میں چھپی کی چھپی ہی ہیں۔ ایسی باتوں کے لئے اظہار بھی ایک پردہ ہوتا ہے اس لئے میں تم سے اب کیا کیا کہوں ــــ؟ اب مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ میں نے جو کچھ بکواس کی ہے وہ جانتی ہو کیا تھا؟ ــــ کم از کم وہی جان لو ــــ
"یہ تھا میری زندگی کا خواب" اور جانتی ہو اس خواب کی نوعیت کیا ہے ــــ؟
وہ خواب تم ہو! ــــ ہاں تم!! ــــ صرف تم ــــ!!!



لگی آگ میرے جگر میں یوں، نہ لگے کسی کے بھی گھر میں یوں

نہ تو لَو اُٹھی، نہ چمک ہوئی، نہ شرر اُڑے نہ دُھواں اُٹھا

آنسہ مہ جبیں ثریا دستگیر

دِل جلتا ہے تو جلنے دے!!

وہ تاریک رات بے حد سرد تھی ـــــ!

میں بالکونی میں کھڑا فضا اور خلاء میں لاشعوری طور پر گھور رہا تھا۔ میرے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ جلتے ہوئے توے کی طرح حلق بالکل خشک تھا۔ موسم باراں کے جھومتے ہوئے بادلوں کی مانند میری آنکھیں بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں کون جانے یہ آنسو کب چھلک پڑیں گے ـــــ یا اندر ہی اندر پی لئے جائیں گے ـــــ! زندگی کے طوفانوں اور ہنگاموں کو سینے سے لگائے میں خاموش تھا آج سامنے کے بنگلہ سے ایک تازہ فلمی ریکارڈ کی آواز آرہی تھی ـــــ

"دل جلتا ہے تو جلنے دے"

یہ درد بھری آواز سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا یہ ریکارڈ

کی ہوئی آواز نہیں، یہ گانا نہیں، یہ راگ نہیں، یہ سُر نہیں، بلکہ ایک پیغام ہے۔ کسی کے دل سے نکلا ہوا طوفان خیز پیغام جو صرف میرے لئے تھا۔ مجھ برباد محبت کے لئے ـــــ لوگ، دنیا والے، ہمارے پیغام کو سنتے ہوئے بھی سُن نہ سکتے تھے۔ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہ سکتے تھے۔ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ نہ سکتے تھے۔ ہائے کس آزادی سے وہ ریکارڈ کا سہارا لیکر مجھے تسلی دے رہی تھی ـــــ

وہ محبت نواز عورت ـــــ جس پر میری زندگی ـــــ میری محبت۔ میرا سب کچھ نچھاور ہو چکا ـــــ!!

لیکن اس جانکاہ صدمہ سے میری روح کا تار تار بکھر گیا اور میں بے کس و مجبور۔ خاموش ـــــ بالکل خاموش ـــــ تھا نہ جانے کیوں میرے ذہن میں رہ رہ کر وہ حسین رات ابھرنے لگی ـــــ رنگ برنگے بادل ندی کے پانی میں تانک جھانک کرنے کے شوق میں دوڑے جا رہے تھے۔ سامنے تالاب میں چھوٹی چھوٹی موجوں کا جال سا بن رہا تھا۔ پھیلنے والی کٹوریوں کا ریلا پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں اپنی بالکونی میں کھڑا لہرا لہرا کر گا رہا تھا۔ جھوم جھوم کر تانیں اڑا رہا تھا

سر پر ایک بڑا ہی شوخ و شنگ پھول آگرا میں چونک پڑا۔
پھول ؟ ارے یہ کدھر سے آگیا ؟؟ اور پھر ایک ہلکا سا
نقرئی قہقہہ فضاء میں تحلیل ہو گیا ــــ میں مڑا ــــ سامنے دو
کالی کالی جامنوں کی طرح چمکدار آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اُسے
دیکھ کر میں نے فوراً اپنی نظریں جھکالیں ــــ پھول اور یہ آنکھیں!
آنکھیں اور یہ پھول ــــ کمبخت کس قدر سُرخ ہے اور یہ آنکھیں
بھونرے تھے جو چپکے ہی چپکے اشارے کر رہے تھے ــــ
زندگی میں ایسا رنگین حادثہ پیش نہ آیا تھا۔ لیکن ہزار دل
واقعات سنے بھی تھے۔ اور پردۂ سیمین پر دیکھے بھی تھے۔
اس لئے مشاہدہ کی قوت نے میرے دل کو ابھارا ــــ میں
فوراً بول اُٹھا ــــ

"اچھا تو آپ ہیں وہ !! ؟"

آنکھیں تن گئیں ــــ کون ؟ ــــ وہ کون ؟؟" ــــ
بڑی میٹھی آواز تھی ــــ "وہ جس نے اتنا بڑا شاہکار
مجھ تک بھیجا ہے ــــ !" ــــ آنکھیں مسکرا پڑیں ــــ پھر ان میں ایک
غیر معمولی چمک پیدا ہوئی ــــ

"تو پھر آپ نے کیا سمجھا تھا ــــ ؟ پھولوں کی بارش

ہو رہی ہے ؟؟"

میں ذرا جھینپ گیا لیکن فوراً ہی میں نے جملہ کسا —— "جی نہیں پھولوں کی بارش تو نہیں —— سمجھا کہ کسی ابابیل کی نوازش ہے" ——

آنکھیں ماند پڑ گئیں —— کوئی جواب بن نہ پڑا۔ میں بات کا رخ بدلنے کی خاطر بے تکلفی پر اُتر آیا ——

"مگر دیکھنا اِس پھول کی لاج رکھ لینا جی چاہے تو اسی کی ڈور سے بندھی، ایکدن، خوشیوں کی افشاں بکھیرتی مجھ تک —— ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ——!؟"

آنکھیں مسکرا پڑیں —— خاموش قہقہہ لگایا اور پھر جھپک سی گئیں ——!

ایک سلونی دوپہر کو وہ چھت پر کھڑی مجھ سے ہم کلام تھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی —— میرے کانوں میں امرت گھول رہی تھی۔ اور میرے دل میں ارمانوں کی نیّا ڈول رہی تھی —— عشق و محبت کا راج تھا ——! میں نے آسمانی رنگ کے ننھے ننھے پھول جیب سے نکالے۔ ماہ تاباں کی طرح چمکتے ہوئے چہرہ پر بکھیر دیا —— وہ لہک کر ہنس پڑی اور

دو چار پھول میرے چہرہ پر بھی شرماتے لجاتے مار ہی دیئے۔ اور ہم دونوں ہنس پڑے ـــــ بے اختیار ـــــ بے خودی کی شراب کا نشہ ہم دونوں کو چور کرنے پر تلا ہوا تھا ـــــ لیکن نہیں ـــــ ہماری محبت اس قسم کی نہیں تھی۔ ہمیں اپنے آپ پر بھروسہ تھا۔ اس کے چہرہ پر بسنت رُت کی رنگینیاں یکایکی اُداس پڑ گئیں۔ اُس نے دور خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا ـــــ

"آج کل ابا کو میرے رشتہ کی بہت فکر ہو گئی ہے۔ کل ہی وہ ماموں جان کے ساتھ کچھ اس قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ میں تو کانپ گئی ـــــ!"

"کس قسم کی باتیں نرگس ـــــ؟" میں حد درجہ پریشان تھا

"نہیں ـــــ نہیں معین!! تمہیں اس قدر پریشاں ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ـــــ میں سب کچھ سنبھال لونگی۔ تم پوری طور سے مطمئن رہو ـــــ!"

میں اور زیادہ حیران و متفکر ہو گیا

"لیکن بات کیا ہے آخر ـــــ؟ مجھے بھی تو بتاؤ ـــــ نرگس دیکھو میں کس قدر متفکر ہو چلا ہوں ـــــ میری اچھی نرگس ـــــ بتا دو ـــــ تمہیں میری ـــــ!" اُس نے اپنا نرم و نازک

ہاتھ میرے منہ پر رکھدیا ——

"بتاتی ہوں معین! — ابا کو ہماری ان ملاقاتوں کا پتہ چل گیا۔ چونکہ میں انکی مرحوم بیوی کی اکلوتی نشانی ہوں وہ مجھے از حد پیار کرتے ہیں۔ بچپن سے اب تک وہ کسی وقت بھی میرے ساتھ اونچی آواز سے تک نہیں بولے —— لیکن اس سانحہ نے ان کے سکون کو بری طرح ٹھیس پہنچایا ہے لیکن ماموں جان کا غصہ ہمارے خاندان میں مشہور ہے —— وہ تمہارے دشمنوں کو ——" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور بری طرح کانپنے لگی —— میں نے اسے اپنے سینے سے لگالیا —— اس کا سانس پھول رہا تھا اور وہ اس خیال سے ہی لرز رہی تھی —— کانپ رہی تھی —— تھرا رہی تھی ——!!!

کالج سے واپسی پر میں نے دیکھا اسکی ہمیشہ کھلی رہنے والی کھڑکی آج خلاف معمول بند ہے —— میرا دل دھڑکنے لگا چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے بیٹھا ہی تھا کہ ایک چھوکرے نے بند لفافہ لاکر دیا —— میں نے فوراً کھولا —— گہرے سرخ رنگ کی روشنائی سے لکھا تھا ——

"جس قدر جلد ہو سکے فوراً کہیں چلے جائیے! اور کل صبح بنگلہ کی

چھت پر مجھ سے ملئے ـــــ خدا حافظ ـــ!!" میں سمجھ نہ سکا
کہ آخر معاملہ کیا ہے ـــ لیکن اس کے غصیلے اور جاہل ماموں
کا خیال آتے ہی میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں نے فوراً
شیروانی پہنی اور گھر سے نکل گیا ـــــ شفیق کے محفوظ گھر
میں بھی میں رات بھر سو نہ سکا۔ صبح صبح میں پھر اس کے
انتظار میں کھڑا تھا ـــــ وہ آئی ـــ اس کا چہرا اترا ہوا سا
تھا۔ خوبصورت آنکھوں میں کاجل کی لکیریں پھیلی ہوئی
تھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پھر آبدیدہ ہو گئی۔ نرگس کا
ایک شگفتہ پھول میرے ہاتھ میں دیکر اس نے نظریں نیچی
کر لیں ـــ وہ شرماتی ہوئی مسکرائی ـــ پھر وہ چلی گئی ـــ
اس نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا تھا۔ کتنی نازک
خیالی تھی ـــ کیسا لطیف تخیل تھا ـــــ! میرا سینہ خوشی
سے پھول گیا ـــــ!

اور پھر ایک سہانی رات ہم دونوں چھت پر بیٹھے
تھے۔ آسمان کسی نوعروس کی کامدار اوڑھنی کی طرح
جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا ـــــ فضاؤں میں مستی سی
چھا گئی تھی۔ میں نے اسکی بلوری کلائیوں میں خوش رنگ

چوڑیوں کو گھماتے ہوئے کہا :۔۔۔۔۔
"نرگس !! تمہارے دعوے تنکے کی طرح بے حقیقت تو نہیں۔۔۔۔؟"
اُس نے آواز میں تمکنت پیدا کر کے جواب دیا۔
"میرے دعوے تو پہاڑ کی طرح اٹل ہیں لیکن ....!"
"لیکن کیا نرگس ؟" میرے منہ سے نکلا۔
"میرے ابا کسی کروڑ پتی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔۔۔!"
اس نے دھیمے لہجہ میں کہا اور میں بڑی طرح آبدیدہ ہو گیا۔
میرا دل درد و کرب سے تڑپ اُٹھا اور میں اپنی اس کمزوری کو چھپانے کی خاطر اُٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ وہ بھی بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی اُس نے میری گردن میں باہیں حمائل کر دیں میرے نین کٹورے چھلک پڑے تو وہ لرز گئی۔۔۔ "تم رو رہے ہو معین ؟؟۔۔۔ "تم رو گے تو میرا کیا حال ہو گا۔؟"
اُس کی کانپتی ہوئی آواز نے میرے دل پر نشتر کا کام کیا۔ اور میں نے بے قرار ہو کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔۔۔!!
اور پھر ایک منحوس صبح اُس کے چھوکرے نے مجھے ایک چٹھی دی لکھا تھا :۔۔۔۔۔

"میری زندگی!

چار دنوں کے لئے اپنے وطن ہو آئیے۔

آپ کی

نرگس"

مجھے اس کا حکم ماننے میں کوئی تامل نہ تھا کیونکہ اس میں میری ہی سلامتی اور خوشحالی پوشیدہ تھی ــــ چار دنوں کے بجائے اِس بار میں گھر والوں کے شدید اصرار پر ایک ہفتہ کے بعد لوٹا ــــ

سات دنوں کے بعد جب میں نے اپنے کمرہ میں قدم رکھا تو میز پر ایک رنگین لفافہ رکھا ہوا پایا۔ دل مسرت سے جھوم جھوم گیا ــــ لیکن نہ جانے کیوں پھر دل بری طرح سسکیاں بھرنے لگا ــــ دھڑکنے لگا ــــ اور پھر یکایک ہاتھوں میں، جسم میں، روح میں، رعشہ سا پیدا ہوگیا ــــ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آخر کار خط کھولا۔

"میری روح!!

شرمندہ ہوں میں نے اپنے

پہاڑ جیسے اٹل دعوے کو

تنکہ کی طرح بے حقیقت
بنا دیا ـــــ صرف اسی لئے
کہ تمہاری جان کی سلامتی ہو
جب میں نے اپنے ابّا سے
اپنے تمام خیر خواہوں سے
اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا
تو ان بے دردوں نے یہ
خطرناک اسکیم تیار کی تمہیں
(خدانخواستہ) موت کی
آغوش میں سلا دیا جائے
اس خیال ہی سے میں کانپ
اٹھی ـــــ میرا رواں رواں
تھرا گیا ـــــ میں نے پھول
پھینک کر تمہیں چھیڑا تھا
پہل کی تھی ـــــ میری نظریں
گنہگار تھیں ـــــ اس لئے
میں نے یہ مظالم سہہ کر تمہیں

تمہیں بچا لیا ہے ___ میرا
شوہر نوجوان ہے ___ خوبرو
ہے ___ تعلیم یافتہ ہے ___
دولت مند ہے ___ لیکن
وہ تم نہیں ہو ___ وہ میرے
جسم کا مالک ہے جو ایکدن
فنا ہو جائے گا ___ لیکن تم
میری روح کے مالک ہو جو
ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ
رہے گی ___!
میری خواہش ہے کہ
تم اسی بنگلہ میں رہو تاکہ کبھی
کبھار تم کو دیکھ تو سکوں!!

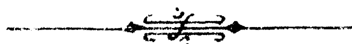
تمہاری مظلوم
"نرگس"

میری آنکھیں موسم باراں کے جھومتے ہوئے بادلوں
کی طرح ڈبڈبائی ہوئی تھیں ___ حلق جلتے ہوئے توے کی طرح

خشک تھا ——— دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔
آنسو جلتی ہوئی آنکھوں میں مچل رہے تھے۔ کون جانے یہ
چھلک پڑیں گے یا اندر ہی اندر پی لئے جائیں گے۔
زندگی کے طوفانوں اور ہنگاموں کو سینے سے لگائے، میں
خاموش تھا اور سامنے کے بنگلہ سے ریکارڈ کی درد انگیز
آواز آرہی تھی ———

"تو پردہ نشیں کا عاشق ہے یوں نام وفا برباد نہ کر
دل جلتا ہے تو جلنے دے آنسو نہ بہا فریاد نہ کر!!"

——— اور وہ تاریک رات بے حد سرد تھی!!!



راز اِس آتشِ نوائی کا مرے سینہ میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینہ میں دیکھ!

(اقبالؒ)

وہ میرا محبوب

اور میں انسلی معنہ

"اس نے مجھ پر جادو سا کر دیا ہے؟"
زبیدہ نے گلاب کی نوشگفتہ کلیوں پر اپنی نظریں گاڑ دیں جیسے ان کے ننھے منے دلوں کے راز جان لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی ترتیب آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک دیکھ کر میں نے پوچھا —— "مگر زبیدہ! تمہیں تو خود اعتمادی پر بڑا ناز رہا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ ایک معمولی قسم کے لڑکے سے تم نے بازی ہار دی ——؟" وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح مسکرا پڑی اور کہنے لگی ——

"روبینہ! تم کیا جانو کہ اس بازی میں میں نے کیسے کیسے حوصلے کئے —— کیا کیا جتن کئے —— کس کس طرح بچتی رہی —— لیکن پھر بھی ہار میری ہی ہوئی —— خود اعتمادی کا سوال اس وقت

پیدا ہوتا ہے جب کوئی خودی میں رہے۔ مجھ پر تو بڑی میٹھی، بڑی پیاری مدہوشی چھاگئی تھی ــــ اور میری اسی بے خودی میں وہ سب کچھ جیت گیا ــــ میرا سکون ــــ میرا چین ــــ میری نیند ــــ میرا اطمینان ــــ سب کچھ اور میں اس کے تصور میں کھوسی گئی ــــ!"

"مگر پیاری دوست! اس سے تمہاری صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ دیکھو تمہارے چہرے پر کس درجہ زردی چھا رہی ہے۔ ہونٹ کچھ بے رنگ سے ہوگئے ہیں۔ بے نیند آنکھیں بھی ویسی دلکش نہ رہیں جیسی پہلے تھیں ــــ اپنے آپ کو سنبھالو زبیدہ ورنہ تباہ ہو جاؤ گی ــــ خدا کے لئے خود پر رحم کرو۔!"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور کھڑکی کے باہر دیکھتی ہوئی بولی:۔

"تم کیا جانو روبینہ کہ ان دنوں میری صحت کتنی اچھی ہے۔ میرے چہرے کی زردی، ہونٹوں کی بے رنگی۔ آنکھوں کی غیر دلکشی کا حال تم سمجھ نہ سکو گی ــــ اگر تم اپنی زبیدہ کو خوبصورت اور پُر بہار دیکھنا چاہتی ہو تو اسے اس کے محبوب کے سامنے دیکھو ــــ اس دم اس کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ چہرہ کی زردی، جاڑوں کے گلاب سے بھی زیادہ گلنار دکھائی

دے گی۔ جذبات کی کشمکش سے چہرہ پر جو تمتماہٹ پیدا ہو جاتی ہے اُسے تم دیکھ نہ سکو گی ــــ یہی بیرنگ ہونٹ انار کی پتیوں سے زیادہ خوش رنگ معلوم ہوں گے اور آنکھیں ــــ ؟ انکی چمک دمک تو آسمان کے ستاروں کو بھی ماند کر دیتی ہے ــــ وہ کہتا ہے ــــ "ان آنکھوں کے دیکھتے ہی میں سب کچھ بھول سا جاتا ہوں ــــ !" پھر یہ آنکھیں شرم سے نیچے کو جھک جاتی ہیں۔ جھک جاتی ہیں اور ان سے نکلتے ہوئے تیروں کو روکتی تھامتی ــــ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھتی ہیں ــــ اس کی خوبصورت آنکھوں سے ٹکراتی ہیں ــــ پھر ــــ ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے ــــ ایک طوفان سا آجاتا ہے ــــ بھونچال ــــ زلزلہ اور پھر ــــ ؟" وہ رک گئی ــــ

وہ پاگلوں کی طرح بکے جا رہی تھی ــــ میں نے قطع کلامی کر کے پوچھا:ــــ

"لیکن زبیدہ ! تم جو اس پر اس قدر پروانہ وار نثار ہو رہی ہو اسکی کیا وجہ ہے ؟"

وہ بڑے ہی دل کش انداز میں مسکرا پڑی اور شرما کر اس نے آہستہ سے کہا:ــــ

"میرا کوئی فعل اختیار میں نہیں رہا ۔۔۔۔ روبینہ!"

"لیکن پیاری زبیدہ یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ کیسے کیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ، کتنے خوبرو اور کس قدر دولت مند نوجوانوں نے تمہارے قدموں میں اپنے دل رکھے۔ تم نے اُن سب کو ٹھوکروں میں روند دیا ۔۔۔ انکی زندگیاں مایوسی سے دوچار ہو کر برباد ہو گئیں لیکن تمہیں ان پر کبھی رحم نہ آیا۔ اور ۔۔۔ اب جب کہ تم خود اپنا نازک سا دل کسی نوجوان کے قدموں میں رکھ چھوڑی ہو تو اس کے انجام سے باخبر رہنا۔ خیر انجام کچھ ہی ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ ۔۔۔۔۔۔!"

انجام سے گریز کیوں کرتی ہو رانی ۔۔۔؟ سن ہی لو کہ اسکا انجام المیہ ہے ۔۔۔۔ قطعی ۔۔۔!!"

میری بات کو کاٹتی ہوئی وہ نہایت اطمینان سے بولی۔

مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی ہو ۔۔۔۔ "زبیدہ ۔۔۔! المیہ؟؟ کیا کہتی ہو ۔۔۔؟ خدا نہ کرے کہ تمہاری معصوم محبت کا انجام المیہ ہو ۔۔۔۔!!"

وہ دیوانوں کی طرح ہنس پڑی اور پھر اُس نے کہا :۔۔۔

"ہاں روبینہ! خدا نے نہیں چاہا تب بھی میری محبت کا

انجام المیہ ہی ہو گا — میں ناکام ہو جاؤں گی — مجھے ناامیدیوں اور مایوسیوں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال ہو جانا پڑے گا اور پھر ایک دن — ایک تاریک دن میرا انجام، میری اس نرالی انوکھی محبت کا آخری منظر شہر کے سب سے بڑے سینو ٹوریم میں ختم ہو جائے گا —!"

"زبیدہ پیاری — ایسی باتیں نہ کرو — خدا نہ کرے کہ تمہیں دق ہو —!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا —

وہ حیران حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی —

"تم کیا چاہتی ہو روبینہ کہ میں اپنی محبت کے امتحان میں ناکام ہو جاؤں —؟ میرے محبوب کے ساتھ میری شادی ہو جائے؟ اور میری محبت سسک سسک کر دم توڑ دے؟ میں محبوبہ سے بیوی بن جاؤں؟ جانتی ہو کسی بہت بڑے ادیب کا کہنا ہے کہ محبت کے بعد جس دن شادی ہو جاتی ہے اس دن محبوبہ مر جاتی ہے اور بیوی رہ جاتی ہے — پگلی دوست تیری زبیدہ محبوبہ ہی رہنا چاہتی ہے جس کی دید کا محبوب ہمیشہ مشتاق رہتا ہے جس کے آگے بات بات پہ ہاتھ جوڑتا ہے — جس کے قدموں کے قریب بیٹھنے میں راحت محسوس

کرتا ہے ـــــ بیوی نہیں کہ جس کی صورت سے بیزار ہو کر وہ اپنے ہی گھر سے دور دور سڑکوں پر گھومتا پھرتا ہے ـــــ ہوٹلوں میں چائے پیتا ہے۔ دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ سارا سارا دن گزار دیتا ہے اور جب گھر آتا ہے تو جھوٹ کا گناہ اپنے سر پر لاد کر بستر پر پڑ جاتا ہے۔ عورت اس کے پیر دابتی ہے تو آنکھیں موند لیتا ہے اور ہزاروں تفکرات اپنے دماغ پر لاد کر سو جاتا ہے ـــــ مر جاتا ہے ـــــ!"

"لیکن زبیدہ! تم نے اتنی بہت سی باتیں کہاں سے سیکھ لیں آخر ـــــ؟ پہلے تو تمہیں سیدھے طور سے بات کرنا بھی نہ آتا تھا۔ لیکن آج تم ایک کامیاب مقرر کی طرح بول رہی ہو۔ کس نے سکھا دیا ہے تمہیں ـــــ؟ بڑے تجربوں کی باتیں کرنے لگی ہو اب تم ـــــ!!"

وہ بڑی طرح شرما گئی اور پلکیں جھپکا کر کہنے لگی:ـــــ

"میرے محبوب نے! ہاں رو بینہ سچ مچ اُسی نے یہ سب باتیں تمہیں بتائی ہیں؟ ـــــ تو کیا وہ تم سے شادی نہیں کرے گا ـــــ؟ کیا وہ تمہارے خوبصورت جسم کا خواہشمند نہیں ہے ـــــ؟"

"نہیں ــــ ہرگز نہیں ــــ وہ مجھے ایک نازک پھول سمجھتا ہے، جس کی خوشبو سے دماغ مہک سکتا ہے۔ جس کے رنگ سے آنکھیں رنگ جاتی ہیں لیکن جس کے چھونے سے وہ برباد ہو جاتا ہے، تباہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ یہ بھی تو کہتا ہے کہ محبت محض ایک جذبہ ہے جسے مادی اور حیاتیاتی حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ــــ محبت میں گداز پیدا کرنے کے لئے آہوں کی بھاپ سے دل کو پگھلا دیا جاتا ہے ــــ جس طرح شیشہ کو زیادہ سے زیادہ پگھلا کر اس میں گداز پن کا اضافہ کیا جاتا ہے اسی طرح دل کے نازک شیشہ کو پگھلانے کے لئے حدت کی ضرورت ہے۔ ٹھنڈک کی نہیں ــــ اور پھر خنکی پہنچانے سے تو یہ غیر حساس ہو جائے گا ــــ اور اس کا دھڑکنا بھی بند ہو جائے گا ــــ

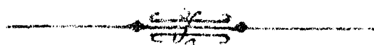
روبینہ! سچ تو یہ ہے کہ میں اس کی اپنی خوبیوں پر مرمٹی ہوں۔ اُس کی انوکھی باتوں کے رس نے مجھے مدہوش کر دیا ہے اس کی نرالی بحث نے مجھے اس کا ہی بنائے رکھا ہے وہ عام لڑکوں سے کس قدر مختلف ہے! اسکی انفرادیت کتنی انوکھی ہے ــــ؟ وہ میرے دل کا خواہاں ہے میرے جسم کا نہیں ــــ! مدت سے میں ایسے ہی آدمی کی تلاش میں

بھی - جو میرے خوابوں کا بادشاہ تھا ـــــ میرے دل کا مالک تھا ـــــ لیکن حقیقت کی دنیا میں کہیں کھو یا سا جاتا تھا ـــــ میری نظروں سے وہ دور ہی دور رہتا تھا ـــــ لیکن میں نے اپنی ہمت کبھی نہ ہاری - اُسے ڈھونڈتی رہی ـــــ اپوری مستعدی کے ساتھ تلاش کرتی رہی ـــــ قوس قزح کے جزیروں میں ـــــ چاند کی ضیا پاش کرنوں میں ـــــ ستاروں کی جھلملاہٹوں میں ـــــ اور پھر ایک چمکیلے دن وہ اچانک میری نگاہوں کے آگے مسکرا رہا تھا ـــــ میں نے اپنا تھکا ہوا سر اُس کے چوڑے سینہ پر ٹیک دیا اور ـــــ اس کے دل کی دھڑکنیں میرے دل کی دھڑکنوں میں جذب ہو کر رہ گئیں - !

روبینہ ـــــ وہ ایک نوجوان ہے ـــــ مردانہ حسن کی ساری خوبیاں اُس میں موجود ہیں ـــــ وہ بھی ہماری تمہاری طرح اپنی زندگی سادہ طریقہ سے بسر کرتا ہے لیکن جانے کیا بات ہے کہ اس کی مسکیوں غزالی آنکھوں میں جو شراب چھلکتی ہے وہ کبھی ڈھلکنے نہیں پائی ـــــ انجم کی طرح وہ بات بات پر رونے نہیں لگتا - اشفاق کی طرح اُس کی آنکھیں بسورے ہوئے منہ پر ڈبڈبانے نہیں لگتیں ـــــ وہ بہت پرسکون طریقہ سے

میری جانب دیکھتا ہے ـــــ وہ میرا محبوب کتنا نرالا ہے ـــــ کیسا انوکھا ہے ـــــ؟!!"

اس کی خوبصورت آنکھوں کی گہرائیاں عمیق سے عمیق تر ہوئی جا رہی تھیں۔ رخساروں پر بڑی پیاری قوس قزح کوندرہی تھی ـــــ عنابی ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں اور کہیں دور ـــــ صنوبر کے سایہ تلے ـــــ پپیہا چیخ رہا تھا ـــــ "پی کہاں! ـــــ پی کہاں ـــــ!!"



کہیں ایسا نہ ہو کہ خود ہی بہک جاؤں میں
اپنی کم ظرفی کی تصویر نظر آؤں میں
اور خود اپنے ہی کردار پہ شرماؤں میں
آج جانا ہے مجھے جام بکف شیشہ بدست!

اِمتحان

"تمہیں معلوم ہے زوجاجہ کہ خدا نے بھی اپنے عرش کے مقابل ایک [illegible] بنا رکھا ہے جس میں وہ اپنے تمام شاہکار رکھتا ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ اُن شاہکاروں میں سے ایک تم بھی ہو ——!!" ظفر بولا وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا ——!! لیکن سوال یہ ہے کہ تم اسے کیوں کر گوارا کرو گے؟" اُس نے اپنی جامنوں جیسی سیاہ چمکدار آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا ——

"اس میں ناگواری کی کیا بات ہے؟ جب میں خدا کے سامنے جاؤں گا تو تمہارے حسن کی قدر دانی دیکھ کر مسکراؤں گا اور کہوں گا ——! بے شک معبود! بے شک، تم نے ایک حسن شناس نظر پائی ہے۔ میں تمہارے انتخاب کی قدر

کرتا ہوں !!" ظفر نے پہلی سی سنجیدگی سے جواب دیا۔
"یہ سب تم خدا سے کہو گے؟؟ اچھا تو پھر وہ تمہاری اس بیہودہ بکواس کا کیا جواب دیگا بھلا؟؟" اُس نے بہ مشکل ہنسی کو روک کر پوچھا۔
"جواب کیا دے سکتا ہے وہ ــــ وہ صرف "تھینک یو جنٹلمین" کہہ کر مسکرا دے گا اور میں کہونگا "مینشن ناٹ سر (MENTION NOT SIR)" زوجاجہ سے ہنسی ضبط نہو سکی اور اس نے بے تحاشا قہقہے لگائے اور وہ ظفر کے ساتھ موٹر میں سوار ہو گئی۔ موٹر ایک جھٹکے کے ساتھ فراٹے بھرتی ہوئی لمبی چمکیلی سڑک پر دوڑنے لگی۔ ظفر نے بیٹھتے ہی بجتے ریڈیو کی ہوئی گھمائی اور ریڈیو نے چیخنا شروع کر دیا "چلو سجن، چلو سجن، دور کہیں جائیں!!"
آج فضا اداس تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اسکی آخری سرخ اور بیمار سی کرنیں زوجہ جا کے شہابی اور شگفتہ رخساروں پر پڑ کر بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کی سیاہی میں سنہری شعاعیں ناچ رہی تھیں اور وہ سامنے راستے کے نشیب و فراز کو دیکھنے میں

ایسی منہمک تھی جیسے اُسے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ساتھی کی موجودگی کا بھی خیال نہ رہا ہو۔ اس کی سفید سفید مخروطی انگلیاں موٹر کی اسٹیرنگ پر گھوم رہی تھیں۔ ظفر نے دیکھا کہ وہ اب شہر سے کافی دور نکل آئے ہیں ـــــ

"زوجاجہ ـــــ تم جانتی ہو کہ ہم ماہیم سے بہت دور آ گئے ہیں۔ کیا آج چوپارٹی پر بھی سیر کو نہیں چلو گی ـــــ؟"
ظفر نے حیرت سے اُس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔ اُس نے اپنے حسین سر کو اسٹیرنگ وہیل پر جھکاتے ہوئے کہا: ـــــ "نہیں ظفر! میرا دل بمبئی کی ساری مصروفیات سے اُکتا سا گیا ہے۔ اسطرح کے روٹین ورک سے طبیعت میں اضمحلال آ جاتا ہے۔ خیال ہوا کہ آج ہم کسی دوسرے مقام کی سیر کریں۔ اس لئے تمہیں میں آج ایک نئی دنیا میں لئے جا رہی ہوں ـــــ!!"

ظفر نے متحیر ہو کر پوچھا ـــــ

"مگر کہاں ـــــ؟ میرے خیال تو ہم نے پچھلے تین مہینوں میں بمبئی کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا اور کوئی مقام ایسا باقی نہیں رہا اب ـــــ!!" وہ معنی خیز نظروں سے ظفر کی دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا تم بمبئی کو اس قدر محدود شہر سمجھتے ہو ظفر ——؟ یا پھر یہ کہ بمبئی کی آبادی کو ہی تم شہر سمجھتے ہو اور اسکی سرحدوں کو کسی دوسرے شہر سے متعلق ؟" ظفر نے خاموش رہنا زیادہ بہتر سمجھا اور راستے کی گھنی جھاڑیوں کو بغور دیکھنے لگا جو بڑی تیزی سے اُن کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ کار بہت سرعت کے ساتھ آگے بڑھتی رہی، منزلیں طے کرتی رہی، اور دونوں ایک دوسرے سے اس قدر قریب اور خاموش بیٹھے رینگتی ہوئی سفید سی سڑک کو دیکھتے رہے۔ ریڈیو اب بھی چیخ رہا تھا" چلو سجن، چلو سجن، دور کہیں جائیں" جیسے اسے بھی ان پریمیوں کے عزم سفر کا راز معلوم ہو جیسے وہ بھی یہ کہنا چاہتا ہو کہ یہ دنیا، ہماری یہ مادی دنیا اب اس لائق نہیں رہی کہ یہاں کسی کو دل میں بسایا جائے، یہاں کسی سے محبت کی جائے۔ شاید اسی لئے پریم کی پیاسی سجنی چیخ چیخ کر اپنے ساجن سے کہہ رہی تھی —— "چلو سجن، چلو سجن، دور کہیں جائیں!!!"

کوئی ایک گھنٹہ کی مسافت طے کر چکنے کے بعد ان کی موٹر شیخ مصری پہونچی جہاں اونچے اونچے ٹیلوں پر سفید عمارتیں نظر

نظر آرہی تھیں۔ ظفر نے تعجب سے زوجاجہ کو دیکھا جس کے جواب میں وہ صرف مسکرا رہی تھی۔ ظفر اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے والہانہ محبت تھی لیکن زوجاجہ چاہتی تھی کہ وہ ظفر کا امتحان لے اور معلوم کرے کہ آیا وہ اُس کے خوبصورت جسم اور لاکھوں روپئے کے جہیز سے محبت کرتا ہے یا پھر اُسے محض اس کے دل ہی سے محبت ہے؟ اور اس کا خیال تھا کہ جب تک وہ اس بات کا کامل طور سے اطمینان نہ کرلے، شادی کا اعلان نہ کرے تاکہ بعد کو اُسے پچھتانا نہ پڑے۔ اُس نے طوطا چشم مردوں کی بہت ساری داستانیں جو سن رکھی تھیں زوجاجہ نے اسی رات ظفر کا امتحان لینے کی ٹھانی ۔۔۔!

اُس رات ہوٹل میں رقص وسرود کی محفل گرم رہی اور کوئی نصف رات کے بعد سب مسافرین اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلئے گئے۔ ظفر نے دو کمرے ایک دوسرے سے متصل لے رکھے تھے۔ ایک میں زوجاجہ سو رہی تھی اور دوسرے میں ظفر نے اپنا بستر لگوالیا تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا ۔۔۔!! لیکن وہ ظفر کی طرف سے کھولا

جا سکتا تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کو شب بخیر کہے نصف گھنٹہ ہوا ہوگا کہ ظفر نے زوجاجہ کی ایک چیخ سُنی۔ وہ حیران ہو کر دوڑا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا لیکن پھر بھی اس کی مسہری کے دہاتی ڈنڈوں کی مدد سے وہ زوجاجہ تک پہونچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے سہمے ہوئے لہجہ میں پکارا

"زوجاجہ ــــــ ؟ ؟ ؟"

لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ آہستہ سے کمرہ کی دیوار تک پہنچ گیا اور اس نے بٹن دبا دیا۔ کمرہ میں روشنی ہو گئی اور ظفر نے مسہری کی جانب دیکھا جہاں کچھ ہی دیر پہلے وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ گیا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ــــ زوجاجہ بستر پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کے خوبصورت جسم پر ایک سیاہ رنگ کی مہین سی چادر ہے، گھنے سیاہ اور ریشمی بال کھلے ہوئے ہیں، آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا ہے۔ اس کا تنفس بری طرح بگڑا ہوا ہے اور ایک نہایت تیز خوشبو سارے کمرے میں پھیل رہی ہے۔ خواب گاہ کی اُس دھیمی سی روشنی میں وہ مجسم شعریت نظر آ رہی تھی، شباب کا جیتا جاگتا مجسمہ نظر

آرہی تھی۔ اس کا نور کے سانچوں میں ڈھلا جسم بے حد پیارا نظر آرہا تھا۔۔۔ ظفر زیادہ دیر تک حسن و شباب کے اس زندہ مجسمہ کو دیکھ نہ سکا۔ اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں اور اس نے محسوس کیا جیسے اُس کے جذبات، اس کے احساسات اُس کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ اس نے دیکھا زوجاجہ بھی تیزی سے سانس لے رہی تھی اور اس کے سینے کا زیر و بم صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ بھی ظفر کی طرح بے حد بے قرار ہے۔

ظفر نے اس کی حالت کا اندازہ لگانے کی خاطر اسے ایک بار پھر خوب جی بھر کر دیکھا جس کے جواب میں وہ معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی ——— مسکراتی رہی اور گھورتی رہی ———!

اس طرح کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا ——— ظفر کا چہرہ عجیب خلفشار کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا تنفس تیز سے تیز تر ہو رہا تھا لیکن وہ ٹکٹکی باندھے زوجاجہ کے حسن کو اپنی نظروں میں سمو لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسکی نگاہوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ دماغ ماؤف سا ہوا جا رہا تھا اور وہ ساکت کھڑا دنیا و مافیہا سے بے خبر سا ہو رہا تھا۔ اسے کچھ بھی

یاد نہ تھا۔ صرف اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک پیکرِ حسن تھا، حُسن و شباب کی معراج تھی ـــ ایک حورِ جنت تھی ـــ اور وہ اُسے گھور رہا تھا۔ اپنے دل اور اپنی نگاہوں میں بسا لینے کی سعی کر رہا تھا۔ لیکن خود اُس کا جسم پتھر کی طرح ساکت و جامد تھا ـــ اور وہ ایک بے جان بت کی طرح اسے دیکھتا رہا!

جب کمرہ کی جرمن گھڑیال نے زور سے چار بجنے کا اعلان کیا تو وہ چونکا اور خاموش اپنا سر جھکائے کمرے سے باہر چلا گیا ـــ!

دوسری صبح وہ صوفہ پر اوندھا پڑا ہوا تھا کہ کسی کا نازک سا ہاتھ اُس نے اپنی پشت پر محسوس کیا ـــ یہ زوجاجہ تھی اُسے اپنے ساتھ واپس لیجانے کے لئے آئی تھی۔ واپسی میں بھی دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی وہ خاموش نگاہوں میں گفتگو کرتے رہے۔ بمبئی پہونچتے ہی وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ـــ!

اور دوسرے دن شہر کے ہر اخبار میں ظفر اور زوجاجہ کے بیاہ کی اطلاع چھپ چکی تھی ـــ!!

تو بھی جانے کہ ملا چاہنے والا مجھکو

ہاں بتا دے ترے صدقے اُسے چاہیں کیونکر؟

اُف یہ مرد!

نیرن بہت ۔۔۔ د ر د مہد

آج ایک عرصہ کے بعد مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔ تم نے یقیناً یہ سمجھ لیا ہوگا کہ حُسنا اس دنیاء فانی سے کوچ کر گئی ہے اور شاید اسی لئے مجھے خاموش دیکھ کر تم بھی پُراسرار طریقے پر خاموش ہوگئیں ۔ حالانکہ تمہارا یہ فرض تھا کہ میری خاموشی سے پریشان ہو کر مجھے خطوط لکھتیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ شاید میری محبت اب تمہارے دل سے غائب ہو چکی ہے اور اب حُسنا، تمہاری سب سے عزیز سہیلی، تمہارے لئے ایک تلخ یاد بن کر رہ گئی ہے ــــــ!!

میری شادی کیا ہوئی تم نے تو یہ سمجھ لیا کہ حُسنا فنا ہوگئی اسکی یاد فنا ہوگئی ۔ اُس کے لئے تمہاری محبت فنا ہوگئی ۔ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے نرگس !؟؟ کیا اسی طرح بھول جانے کی

خاطر تم نے ابدی محبت کے وعدے کئے تھے؟ کیا اسی طرح پُراسرار طور پر خاموشی اختیار کر لینے کی خاطر تم نے میری شادی کے بعد، جدا ہوتے وقت میرے گلے میں باہیں ڈالکر روتے ہوئے مجھ سے ہر ہفتے ایک خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا؟ کیا اسی طرح میری یاد تک کو اپنے دل سے نوچ پھینکنے کی خاطر تم نے زندگی بھر مجھے یاد رکھنے کی قسمیں کھائی تھیں؟ خیر!! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں نرگس! کوئی شکوہ نہیں کیونکہ قصور صرف تم ہی سے سرزد نہیں ہوا۔ صرف تم نے ہی مجھے بھلائے نہیں رکھا بلکہ میں خود بھی تمہاری قصوروار ہوں۔ میں نے بھی تو تمہیں ان پانچ مہینوں میں ایک بار بھی یاد نہیں کیا۔ پھر کس منہ سے میں تمہیں گنہگار کہوں، بے مروت کہوں، بے وفا کہوں؟ حقیقت تو یہ ہے نرگس! انور کو پا کر میں خود کچھ اس طرح کھو گئی ہوں کہ آج کل مجھے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں۔ مجھے تو اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سارے جہاں کی مسرتیں میرے قدموں پر آن پڑی ہوں۔ زندگی ایک طویل، بہت طویل پریم کہانی بن گئی ہے جس میں صرف حسین نقرئی قہقہے ہیں اور پریم بھری سرگوشیاں ہیں اور

جس میں محبت کے نشہ میں مست وہ خوش نصیب ر وحیں ماضی، حال اور مستقبل سے بے خبر زندگی کی ان ازلی مسرتوں میں بُری طرح کھو گئی ہیں۔ زندگی کی کشتی بہے جا رہی ہے منزل سے بے خبر!

اکثر رات کی تاریکی میں جب ساری کائنات ایک ناقابلِ بیان سرور میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ انور سے اس قدر قریب اپنے کمرہ کی تنہائی میں جب میں اپنے حال پر غور کرتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ حقیقت نہیں ایک دلفریب خواب ہے جیسے میں ایک بہت ہی حسین طرب افزا دنیا میں آگئی ہوں جہاں کی فضا خواب آلودہ ہے، جہاں کے باسی خواب آلودہ ہیں، جہاں کا ذرہ ذرہ خواب آلودہ ہے۔ میرے شوہر ہندوستان کے ایک مشہور ادیب ہیں اور اردو کے اُبھرتے ہوئے فن کار ہیں۔ ان کی دلچسپ شخصیت کے بارے میں کیا لکھوں ہیں؟؟ دل چاہتا ہے بس ان ہی سے متعلق لکھتی رہوں لیکن پھر ڈر بھی لگتا ہے کہ اُن کی تعریف سن کر کہیں ہماری شریر نرگس میرے انور پر عاشق نہ ہو جائے —!
یاد ہیں وہ بچپن کی دلچسپ باتیں نرگس؟ ہم دونوں نے تو

وعدہ کیا تھا، قسمیں کھائی تھیں کہ شادی ایک ہی مرد سے کرینگے؟
اب وہ باتیں یاد آتی ہیں تو اپنی حماقتوں پر بے اختیار قہقہے لگانے
کو جی چاہتا ہے۔ اگر انور کو اس کا علم ہو گیا تو بنو تمہاری خیر نہیں
وہ تمہیں بھی میری طرح ہڑپ کر کے ہی دم لیں گے۔ کیا عجب کہ
وہ تمہاری امی کی حضور میں ان کی احمق بیٹی کی بہت پرانی قسمیں
یاد دلا کر شادی کی درخواست بھیج ہی دیں لیکن نہیں نہیں بابا۔
ہم تو یہ ہرگز نہ ہونے دینگے۔ اب اگر تو نے میری لاکھ خوشامدیں
بھی کیں تو بھی میں اس کی ہرگز اجازت نہ دونگی۔ ویسے پیاری
نرگس! تم میری سب سے عزیز سہیلی ہو۔ لیکن بھئی! یہ شوہر والے
معاملہ میں تو ہم ذرا کنجوس ہی واقع ہوئے ہیں اور ہر حالت میں
انور کو اپنا اور صرف اپنا ہی بنائے رکھنے کے قائل ہیں۔ اب اسے
تم خود غرضی کہہ لو یا کچھ اور۔ یہ حقیقت ہے اور حقیقت ہمیشہ کڑوی
ہی ہوا کرتی ہے۔ اور پھر نرگس! تم بھی تو چودھویں کا چاند ہو!!
شمع اگر جلتی رہے تو پروانے خود بخود جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر کیا
وجہ ہے کہ آج تک ہماری نرگس کے گرد پروانوں نے طواف
کرنا کیوں شروع نہیں کیا؟ بھئی ہو سکتا ہے ایک آدھ پروانہ
گرفتار بھی ہو چکا ہو۔ ہم ہیں ہی اتنی دور کہ وہاں کی خبروں سے

بے خبر ہیں۔ تجھے میری قسم نرگس! کچھ تو لکھ اپنے معاشقہ سے متعلق۔! کمبخت کیا تو ایک چلتے پھرتے نوجوان کو یوں خاموش چٹ کر جانا چاہتی ہے؟؟ میں جب اپنے پروانہ سے متعلق غور کرتی ہوں تو دل سے بے اختیار یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا میری پیاری عزیز سہیلیوں کو ایسے ہی پروانے بخشے تم نہیں جانتی نرگس۔! شہر کے شور و شغب سے دور، فطرت کی دلفریب خاموشیوں سے اس قدر قریب ہمارے دن کتنی تیزی سے گذر رہے ہیں۔ وہ مجھے ایک پل بھی خاموش رہنے نہیں دیتے ایک پل بھی افسردہ نہیں رہنے دیتے۔ کبھی کبھی جب ان کی غیر حاضری میں مجھے میکہ یاد آتا ہے، اپنے عزیز و اقربا یاد آتے ہیں اپنی عزیز سہیلیاں یاد آتی ہیں تو دل بے اختیار اداس ہو جاتا ہے اور میں دریچہ سے قریب سرنگوں بیٹھی اپنے ماضی اور حال پر غور کرنے لگتی ہوں۔ ہمارے سفید سے بنگلہ سے قریب ہی ایک چھوٹا سا دریا آہیں بھرتا گزرتا ہے۔ اس سے قریب دور افق کے کنارے آسمانوں سے باتیں کرتی نیلی نیلی گھاٹیاں ہیں جو ہر روز اپنی بے نور آنکھوں سے اب مجھے اور میری لامحدود مسرتوں کو دیکھ دیکھ کر یقیناً رشک کرنے لگی

جب وہ گھر لوٹتے ہیں اور مجھے یوں سرنگوں بیٹھے دیکھتے ہیں تو دبے پاؤں آکر میرے کان سے قریب بالکل شیروں جیسی آواز نکالتے ہیں اور میں گھبرا کر اچھل پڑتی ہوں اور پھر ہمارے جوان قہقہوں سے ہمارا عزیز آشیانہ گونجنے لگتا ہے۔

میں نے شادی سے بیشتر مرد کی نفسیات اور ان کے کردار پر بہت ساری کتابیں پڑھی تھیں۔ اب شادی کے بعد میں ایک فن کار کا کردار اور اس کی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ کر رہی ہوں نرگس!

تم نے انور سہیل کے بہت سارے افسانے پڑھے ہونگے ان کی وہ سنجیدہ سی تصویر بھی یقیناً دیکھی ہوگی۔ جو ملک کے اکثر رسالوں میں شایع ہو چکی ہے۔ لیکن اس ظاہری سنجیدگی کے پس منظر کتنے قہقہے چھپے بیٹھے ہیں۔ کتنی شرارتیں پوشیدہ ہیں اس کا تمھیں اندازہ نہیں۔ میں نے تو ان پانچ مہینوں میں آج تک انہیں کبھی اداس نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں اکثر یہ خاموش مسکراہٹیں طویل قہقہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو میرا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو جاتا ہے۔ لیکن نرگس! تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ انور سہیل کے کردار کا صرف ایک رخ ہے

ان کا دوسرا رخ آجتک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ شاید صرف میں نے ہی اس کا مطالعہ کیا ہے۔ تم نے تو انکی تازہ کہانی پڑھی ہو گی۔ ارے وہی۔ "آخری سلام"۔ جو ابھی پچھلے مہینہ "نورنگ" میں شایع ہوئی تھی۔ میں نے جب اسے شادی کے فوراً بعد پڑھا تو رخشی کے کردار نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ اور پھر میں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ دنیا واقعی اتنی بے درد ہے کہ اسے رخشی کی جوانی پر بھی رحم نہ آیا ۔ ؟ رخشی نے اپنے حسن آورش کے لئے اپنے جن اصولوں کی خاطر اپنی ساری زندگی برباد کر لی تھی اس کا صلہ کیا اتنا ہی گھناؤنا تھا جتنا کہ اسے ملا ہے ؟ کچھ ایسے ہی الجھے ہوئے خیالات کے دوران میں یکایک مجھے اس کے مصنف کا خیال آگیا۔ اس کا مصنف میرا عزیز شوہر میرا اپنا انور جو صرف میرا ہے اور پھر مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کہانی اسی فن کار کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ اسی نوجوان ادیب کی تخلیق ہے جو ہمیشہ مسکراتا رہتا ہے دنیا نے جسکی زندگی کو صرف جواں سال قہقہے سمجھ رکھا لیکن دنیا کو کیا معلوم کہ ان قہقہوں کے پس منظر چالیس کروڑ انسانوں کی بدبختی کا غم ہے۔ ان کے تاریک مستقبل کے نوحے ہیں

ان کی افسردہ بے نور آنکھوں کے لرزتے آنسو ہیں جنہیں فن کار بڑی محبت سے جمع کرتا ہے اور پھر ان میں اپنا خون جگر ملا کر کاغذ پر بکھیر دیتا ہے۔ انور میرے لئے ایک عجیب معمہ ہے نرگس! جب تک وہ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ جب تک میں ان سے قریب ہوں وہ زندہ دلی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ لیکن رات کی خاموشی میں کسی ایک بظاہر معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر اپنے سے کمزور بے بس انسانوں کے دکھ درد سے بے قرار ہو کر، اپنے سر پر ہاتھ رکھے، ٹیبل لیمپ کی پھیکی سی روشنی میں سر جھکائے وہ لکھنا شروع کرتے ہیں تو اس وقت انور سہیل ایک مختلف شخص ہوتا ہے۔ اس میں اور میرے عزیز انور میں کوئی موافقت نہیں ہوتی۔ اس وقت تمہاری سہیلی کی سرد آہیں اور اسکی مرمریں باہیں اور اس کے نازک سے دل کی دھڑکن بھی ان پر کوئی اثر نہیں کرتی نرگس!

ہم شام بلا ناغہ دریا کی سیر کو چلے جاتے ہیں۔ اونچی نیچی گھاٹیوں میں سے ہوتے ہوئے بہت دور نکل جاتے ہیں اور جب اس سیر سے میں تھک سی جاتی ہوں تو پھر ان کا سہارا لئے میں واپس لوٹتی ہوں۔ تمہیں ابھی اس کا تجربہ نہیں نرگس! ورنہ تم

اس کا اندازہ لگا سکتی کہ اپنے عزیز جیون ساتھی کے بازو کے سہارے زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر منزل کی طرف آگے بڑھتے ہوئے کتنا سکون حاصل ہوتا ہے۔

فن کار انور کے مچلتے ہوئے جذبات اور انکی باغی روح کی بہت ساری داستانیں ہیں۔ تم میرے اس خشک خط سے یقیناً اکتا گئی ہوگی۔ اور سوچ رہی ہوگی کہ حنا آج کل کتنی فضول سی ہوگئی ہے۔ جو سوائے اپنے انور کے گن گانے کے اور دوسرا اسے کچھ آتا ہی نہیں۔ خیر! نرگس ڈیر! خدا کرے تمہاری زندگی میں بھی وہ دن جلد آئے جب تم کسی کو سونپ دی جاؤ۔ اس وقت تمہیں اندازہ ہوگا۔ میرے موجودہ موڈ کا۔ آؤ نرگس رانی! آج تمہیں انور کی دلچسپ شخصیت کی ایک کہانی سناؤں اس انور کی، جو صرف میرا ہے۔ شاید اس سے تمہارا دل بہل جائے۔

ایک ابر آلودہ شام ہم دونوں حسب معمول سیر کو نکلے۔ لیکن یکایک رم جھم بارش شروع ہوگئی۔ اس لئے ہم اپنے باغیچہ ہی میں ٹھیر گئے۔ ہمیں وہاں گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دور سے ہمیں سارنگی کی درد بھری آواز سنائی دی۔ پاس کے گاؤں میں سارنگی والا تھا جو اکثر اپنی سارنگی لئے اِدھر

اُدھر بھٹکتا پھرتا۔ میں نے اکثر اپنے کمرہ سے اسکی سارنگی کے اداس نغمے سنے تھے۔ نہ جانے کیوں اسے یہ اُداس نغمے پسند تھے۔ نہ جانے کیوں اُس شام سارنگی کی غم زدہ آواز سنائی دی تو دل بے قرار ہو اٹھا۔ اور پھر جب سارنگی والا باغیچہ کی فینسنگ سے قریب آیا تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اسکی سارنگی نہیں بلکہ اس کا دل رو رہا ہے ویسے تو تم جانتی ہی ہو نرگس۔ میں کافی جذباتی واقع ہوئی ہوں لیکن اس روز میرے جذبات میرے ساتھ تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں سارنگی کے افسردہ سے نغمہ نے مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کیا۔ کوئی ساٹھ سال کی عمر تھی اس کی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ منہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں بدن پر ایک میلا پیوند لگا کوٹ اور پتلون تھے۔ سر کے بال بڑے بڑے تھے اور اسکی آنکھیں ــــــ ؟؟ اُف میرے اللہ! اسکی زرد سی افسردہ آنکھیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک جہاں کا غم اسکی ان آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر گیا ہو وہ ہمیں دیکھ کر رک گیا اور اس نے ہماری خاطر دو بہت ہی اُداس نغمے بجائے اور پھر انور نے ایک روپیہ دیا تو جھک کر اس نے

ہمیں سلام کیا اور اپنی اس پرانی سارنگی پر وہی اس کا پسندیدہ نغمہ بجاتا وہ چلا گیا۔ اس کے جانیکے بعد سارنگی کی دھیمی سی آواز فضا میں تھراتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ تحلیل ہوتی گئی۔ سارنگی والے کے اداس نغموں نے ہم دونوں کو بری طرح خاموش کر دیا تھا۔ میں ان کے شانے پر سر رکھے خاموش بیٹھی سینڈل کی نوک سے زمین کرید رہی تھی "اف بیچارہ بوڑھا! تباہ ہو گئی اس کی زندگی!" انور نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا

"آپ واقف ہیں اس بوڑھے سے؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا

"اس سے کون واقف نہیں حسنا؟ ہمارے اس علاقہ کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے۔ میرے لئے تو وہ ایک ساز شکستہ ہے ایک ایسا راہی جس کی منزل کا پتہ نہ ہو۔ جسے کشمکش زندگی میں تنہا بھٹکتا چھوڑ دیا گیا ہو۔ اپنی مختصر سی زندگی میں مجھے کسی کردار نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ اس بوڑھے نے۔ اسکی داستان زندگی سننے کے لئے پتھر کا دل چاہئے حسنا!" انہوں نے دور خلاء میں دیکھتے ہوئے خواب آلودہ لہجہ میں کہا۔ وہ آج بے حد آزردہ معلوم دے رہے تھے۔

"کیا اس کی داستان سچ مچ اس قدر ٹریجک ہے؟ آپ تو اس

اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔؟!!" میں نے پوچھا۔"ہاں حسنا! میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن چھوڑو بھی اس قصہ کو مجھے تو اس سے بیحد تکلیف ہوتی ہے۔ دل بیٹھنے لگتا ہے اور بے اختیار خدا سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر حقیقی محبت کی یہاں کوئی قدر نہیں تو پھر لفظ " وفا " کی یہاں تخلیق ہی کیوں ہوئی؟ اگر ناجو کو یوں بے وفا کہلانے کی آرزو تھی تو کیا ساری دنیا میں صرف وہ بد قسمت بوڑھا ہی رہ گیا تھا جس سے وہ دل لگاتی اور پھر جب جی بھر جاتا تو اس کے شیشۂ دل کو بے دردی سے چکنا چور کر کے چلتی بنتی؟ صنف نازک بھی کبھی کبھی کس قدر سنگدل ہو جاتی ہے ۔۔۔!!" وہ اداس لہجہ میں بولے۔

کیا ناجو ہی اس سارنگی والے کی تباہی کی ذمہ دار ہے؟ لیکن یہ ناجو تھی کون؟؟ ۔۔۔۔ بوڑھے کی محبوبہ؟؟؟" میں نے پوچھا۔ مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہو گئی تھی۔

"اب تم تو ساری داستان سنکر ہی رہو گی حسنا!" انور نے دھیمے لہجہ میں کہا ۔۔۔۔ "بوڑھے کی عمر کچھ اس قدر زیادہ نہیں وہ تو ناجو کی جدائی نے اسے قبل از وقت بوڑھا بنا دیا ہے! اس کا یہاں ایک مشہور ہوٹل تھا۔ دور دور سے سیاح نہ صرف

ان پہاڑوں کی سیر کو آیا کرتے تھے۔ بلکہ اکثر بوڑھے کے ہوٹل کی شہرت انہیں یہاں کھسیٹ لاتی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ سیاحوں کو ہوٹل کی "منو" (menu) سے زیادہ ناجو سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر بوڑھے سے قریب کاؤنٹر پر بیٹھا کرتی اور اپنی دلفریب اداؤں سے بوڑھے کا دل بہلایا کرتی۔ بوڑھے کو ناجو سے والہانہ محبت تھی۔ اور وہ صرف اسی کے سہارے زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ اکثر راتوں کو بوڑھا اپنی سارنگی بجایا کرتا اور اس کی تال پر ناجو اپنے حنا مالیدہ پیروں سے دیوانہ وار رقص کیا کرتی۔ بوڑھے کو شاید ناجو کے رقص سے بھی عشق تھا۔!" وہ خاموش ہو گئے۔ اب بارش رک گئی تھی۔ اور ہمارے آس پاس کے بنگلوں سے بہت سارے حسین جوڑے سیر کو نکل کھڑے ہوئے تھے۔ میں پوری داستان سننے کے لئے بیقرار سی ہو رہی تھی۔ اس لئے انکی خاموشی بری طرح کھٹکنے لگی۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

پھر ـــــ!!" وہ خواب آلودہ آواز میں بولے۔

"پھر وہی ہوا۔ جو آجتک اس مکار دنیا میں ہوتا آیا ہے فلک کج رفتار کو بوڑھے کی مسرتیں ایک آنکھ نہ بھائیں اور اس کا

ایک اشارہ بجلی کی طرح بوڑھے کے آشیانہ پر پڑا۔ اور اسکی دنیا تاریک ہوگئی۔ ایک شام بوڑھا بازار سے لوٹا تو ناجو غائب تھی اسے وہاں نہ پاکر بوڑھے نے اپنا دماغی توازن کھو دیا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ لیکن اسکی چند روزہ پریم کہانی تو دم توڑ چکی تھی۔ بھلا اب ناجو اسے کاہیکو ملتی۔۔! اس کا ہوٹل تباہ ہوگیا۔ اس کی دولت گئی۔ غریب کی ساری پونجی لٹ گئی۔ اور وہ آج بارہ سال سے ناجو کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ وہ ہر شام ہمیشہ ناجو کا پسندیدہ نغمہ بجایا کرتا ہے۔ بدبخت کو شاید اب بھی موہوم سی امید ہے کہ اس کا نغمہ ناجو کو بیقرار کردے گا۔ اور وہ ضرور لوٹ آئیگی۔ یہاں کے قدیم باشندوں کا خیال ہے کہ ناجو اس شام کسی دولتمند سیاح کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی اور شاید اب بھی وہ اسی کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا رہی ہے۔۔!"

انہوں نے داستان ختم کی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ایک بار پھر گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ سفید سفید بگلے قطار در قطار اپنے گھونسلوں کی طرف واپس ہو رہے تھے "کتنی دردبھری کہانی ہے بیچارے کی!" میرے منہ سے نکلا۔

میری آنکھوں میں شاید آنسو چھلک رہے تھے۔
"ہاں حسنا! خدا جانے اسکی ناجو کب ملے۔؟ اسکی زندگی تو اب تباہ ہو چکی ہے"۔ وہ بولے میں نیچی نظریں کئے سینڈل سے زمین کریدتی رہی
"اس کے والدین نہیں ہیں کیا؟ شاید وہ اپنے محبوب سے کسی وجہ روٹھ کر میکے چلی گئی ہو" میں نے پوچھا۔
"کتنی بھولی ہو تم حسنا۔ تمہاری جیسی لڑکیوں کیلئے ہی تو چچا غالب نے یہ لکھا تھا۔ اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا!" انہوں نے کہا۔
"خدا معلوم ناجو کے والدین کہاں ہونگے؟!" میں نے اداس ہو کر کہا۔ اونہہ۔ ہونگے کسی جنگل میں!! وہ بولے۔
"جنگل میں؟؟" میرا ماتھا ٹھنکا۔
"اُف خدارا۔ اب اندر بھی چلو۔ مجھے تو سردی لگ رہی ہے!"
انہوں نے میرے سوال کا جواب دیئے بغیر کہا اور پھر ہم دونوں واپس ہوئے میرے ذہن میں اب بھی اس بدقسمت لڑکی کی داستان تھی۔ نہ جانے کیوں بار بار اس کا وہ اداس چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے پوچھا۔
"آپ نے یہ کیا کہا کہ اس کے ماں باپ کسی جنگل میں ہونگے؟ جنگل میں نہیں تو پھر کسی شہر ہی میں ہونگے۔ لیکن بھئی!

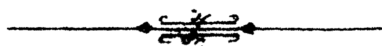
یہ تو میں نے آج ہی سنا ہے کہ بندر بھی شہروں میں رہتے ہیں"
اُنھوں نے لاپرواہی سے جواب دیا ـــــ

بندر ـــــ ؟؟؟؟ میرے منہ سے چیخ نکلی اور انہوں نے قہقہہ لگایا۔ غصہ سے میرا بُرا حال تھا اور ہنسی سے ان کا۔

دوسرے دن باورچی سے پتہ چلا کہ اُس سارنگی والے کو ایک بندریا بہت عزیز تھی۔ چند ماہ ہوئے وہ کہیں بھاگ گئی۔ بوڑھا پریشان اس کی تلاش میں سرگرداں ہے ـــــ

سنا تم نے نرگس ـــ ایسے ہیں میرے انور۔ خدا سے دعا ہے کہ ہماری نرگس کے حضرت پروانہ بھی ایسے ہی زندہ دل۔ لو ڈیر اب معاف بھی کرو ـــــ آیندہ کچھ کہوں تو پھر تمہارا ہاتھ اور میرے کان !! یہ بار بار روٹھ جانا اچھا نہیں بھئی ـــ ! ہم تو تمہارے بھلے ہی کو دعائیں دے رہے تھے ـــــ اچھا خدا حافظ نرگس ـــ !

تمہارے خط کا شدت سے انتظار رہے گا ـــــ



ساعتِ موت وہی زیست کے دن رات وہی

حسن اور عشق کی دزدیدہ ملاقات وہی

عہد و اقرار وہی حرف و حکایات وہی

گرچہ موجود نہیں روئے زمیں پر اب تم!!

تصنیف پیش کرنے کی جراءت کی ـــ بس شروع ہو جاتی ہیں۔
اس پر تنقیدوں کی برسایتں ـــ اس پر نئے نئے انداز میں
تبصرے کئے جاتے ہیں۔ اس نئی تصنیف کے ہر پہلو پر، مثلاً
اس کے افادی پہلو، اس کے ترقی پسند پہلو، اس کے جمالیاتی
پہلو، اس کے معاشرتی پہلو اور خدا جانے کون کون سے پہلوؤں
پر بے تحاشا روشنی ڈالنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ میں ان
چیزوں سے تو نہیں گھبراتی۔ ویسے میں بچپن ہی سے کافی
بولڈ (Bold) اور ڈھیٹ قسم کی واقع ہوئی ہوں۔
لیکن بھئی! ایک چیز ہے جس سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے،
اور وہ ہے سوالات کی بھرمار ـــ اسی لئے مجھے وہ لوگ
بہت پسند ہیں جو پوچھتے کم ہیں اور سنتے زیادہ ہیں۔ اب
اسی کتاب کی اشاعت کے مسئلہ ہی کو لیجئے نا ـــ جہاں
کوئی نئی کتاب مارکٹ میں آئی کہ بس شروع ہو جاتے ہیں
سوالات ـــ! اگر سیدھے سادھے عام قسم کے سوالات
ہوں تو کوئی بات ہی نہیں لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ایسے
عجیب عجیب سوالات کئے جاتے ہیں کہ تو بہ بھلی ـــ!!
پوچھا جاتا ہے آپ ترقی پسند ہیں یا رجعت پسند؟ (اس سوال سے

تو میں بری طرح گھبراتی ہوں) آپ کہانیاں کیوں لکھتی ہیں؟
آپ کی کہانیوں کا کوئی مقصد بھی ہوتا ہے ــــــ؟ وغیرہ
وغیرہ ـــ اب آپ ہی دیکھئے نا ـــ اس کراس ایگزامینیشن
(Cross Examination) کے آگے کون ٹِک سکتا ہے؟
اور پھر میں تو ایک مشرقی لڑکی ہوں جس کی ہر حرکت کو دنیا
والے اپنی خوردبین سے مطالعہ کرنے کے عادی ہیں ـ
توجناب ـــ آمدم برسرِ مطلب ــــــ اپنے اس مجموعہ میں
"میں اور میرے افسانے" شامل کرنے کی صرف اسی لئے
ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے متعلق لوگ غلط فہمیوں
میں مبتلا نہ ہوجائیں اور میری اس حرکت کو ایک بہت بڑی
گستاخی سمجھ کر مجھ بدنصیب کو بھی جرح کی خاطر عدالت کے
کٹھرے میں نہ لا کھڑا کریں! سب سے پہلے میں یہ صاف
طور پر بتا دینا چاہتی ہوں کہ نہ میں ترقی پسند ہوں اور نہ
رجعت پسند ـ ویسے میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ
میں کون ایسا بدنصیب ہے جسے ترقی، پسند نہیں؟ ہر ایک
انسان کو میں نے ہمیشہ ترقی کے خواب دیکھتے دیکھا ہے! اگر
یہ صحیح ہے تو پھر یہ ادبی گروپ بندی چہ معنی دارد ـــ؟

تو بھئی! اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب میں نہ تو ترقی پسند ہوں اور نہ تنزل پسند تو پھر میں نے کہانیاں لکھنے کی جراءت کیسے کی؟ تو اس کا جواب بھی سن لیجیے!

میں کہانیاں صرف اس لئے لکھتی ہوں کہ میرا جی کہانیاں لکھنے کو چاہتا ہے اور جب تک جی چاہتا رہے گا انشاءاللہ کہانیاں ضرور لکھتی رہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ آج ان میں سے چند آپ کی خدمت میں بھی پیش کی جا رہی ہیں اگر پسند کی گئیں تو پھر دوبارہ پیش کی جائیں گی اور اگر فضول سی سمجھی گئیں تو اپنا شوق پورا کرنے کی خاطر لکھنے کے بعد کسی پرچے کے صفحات کی بجائے میری سنہری بیاض ہی میں رہ جائیں گی۔ میری کہانیوں کے متعلق ایک بات اور واضح کر دوں وہ یہ کہ کہانی لکھنے کا میری دانست میں نہ کوئی خاص مقصد ہوتا ہے اور نہ کوئی خاص پہلو۔ ویسے جب میری کہانیاں کہانیاں ہی ہیں تو آئے دن شائع ہونے والی دوسری کہانیوں کی طرح ان کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہو گا۔ لیکن بدقسمتی سے میں اس سے قطعاً ناواقف ہوں کہ مندرجہ بالا پہلوؤں میں سے میری کہانیوں میں کونسا پہلو

زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ نہ میں نے اس پر کبھی غور کیا ہے اور نہ کبھی غور کرنے کی امید ہے کیونکہ میں بے حد سست واقع ہوئی ہوں۔ اگر سست نہ ہوتی تو شاید آج صرف عزیز النساء جیسی کی بجائے میں ڈاکٹر عزیز النساء جیسی ہوتی لیکن کچھ تو اس سستی نے اور کچھ مردوں کی چیر پھاڑ کے تصور نے مجھے صرف عزیز النساء جیسی ہی رہنے دیا!

مجھے بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے اور سننے کا بہت شوق رہا ہے جب وقت کی رفتار کے ساتھ مجھ میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو میں نے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ اسکول کے زمانے میں بچوں کے پرچوں کے لئے کہانیاں لکھا کرتی تھی۔ جب کالج میں داخل ہوئی تو بڑوں کے لئے کہانیاں لکھنے کا خبط سوار ہوا۔ عرصہ ہوا ایک انگریزی فلم سے متاثر ہو کر ایک انتہائی فضول قسم کا رومان لکھ مارا جو بدقسمتی سے ایک اچھے پرچے میں شایع بھی ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا سہیلیوں نے "ادیبہ ادیبہ" کی رٹ لگا کر مجھے ایک خطرناک قسم کی خوش فہمی میں مبتلا کروا دیا۔ اس کے بعد ریڈیو سے کچھ چیزیں نشر ہوئیں تو یہ لکھنے لکھانے کا خطرناک سودا دماغ

ایک جزبن گیا۔ ویسے مجھے سسکتی انسانیت اور مزدوروں کی دنیا، چھتّن پان والے اور تلنگانہ کی اشتراکی تحریکوں سے بھی دلچسپی رہی ہے لیکن اب اسے کیا کیجئے کہ جب ان سے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کرتی ہوں تو قلم سخت موڈی ثابت ہو جاتا ہے اور جب حضرت موڈ آتے ہیں تو بے اختیار ایک خیالی پریم نگری کی حسین داستانیں لکھنے کو جی چاہتا ہے جس میں بقول ایک مشہور فن کار ——— محبت کا لوچ رکھنے والے دلوں کی میٹھی میٹھی دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ شاید یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی سوائے جوان دلوں کی دھڑکنیں سننے اور ان کی پریم کہانیاں لکھنے کے کوئی دوسری چیز پیش کرنے کو میرا جی ہی نہیں چاہتا۔ بہت ممکن ہے کہ آج سے کچھ برسوں بعد جب میرا فن ارتقائی منزلوں سے گزر کر ایک مرکز پر Settle ہو جائے گا اور جب جوان دلوں کی میٹھی میٹھی دھڑکنیں اور پریم نگر کے پریمیوں سے زیادہ مجھے تڑپتی انسانیت اور ملک کی غربت اور افلاس متاثر کر سکیں گے۔ اس وقت شاید میرا فن صحیح معنوں میں ترقی پسند ادب پیش کر سکے گا ——— جب تک میرے فن کا

وہ سنہرا دور نہیں آجاتا۔ مجبوراً میں سہمے سہمے لہجہ میں خالص رومانی کہانیاں ہی سناتی رہونگی۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرا مطالعہ بہت زیادہ وسیع نہیں۔ لیکن اس کی ذمہ دار میں نہیں بلکہ ہماری جامعہ کا اتنا بہت سا کورس ہے جس نے سوائے پارکر اینڈ ہاسویل (Parker + Haswell) کی قسم کی ضخیم کتابوں کے ادب کی طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بچپن میں "الف لیلیٰ" اور قصۂ امیر حمزہؓ سے لیکر رابن سن کروسو اور "گیلی وازٹرویلز" تک بے حد پسند تھیں۔ کالج کے زمانہ میں کچھ عرصہ تک ڈوما (Dumas) اور کیٹس دل و دماغ پر چھائے رہے۔ بعد کو ہکسلے (Hux ley) ایلیٹ (Eliot) اور جین آسٹن نے (Jane Austin) بہت زیادہ متاثر کیا —— اردو کے لکھنے والوں میں کسی زمانے میں پریم چند اور اسلم پسند تھے۔ اور اب عصمت چغتائی ہاجرہ مسرور، ابراہیم جلیس، کرشن چندر، اور عزیز احمد کے علاوہ [illegible] عنایت اللہ بھی بہت زیادہ پسند ہیں۔ میرے اپنی [illegible] بیس سالہ زندگی میں انسانی فطرت [illegible] دماغ

تم بڑی سنگدِل ہو!!!

زندگی بنتی ہے اور بگڑتی ہے ـــــ زندگی بگڑتی ہے اور پھر بنتی ہے۔ دن خواہ اچھے ہوں یا بُرے بیت ہی جاتے ہیں مگر انسانی امیدوں کا ان دنوں میں دخل ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو ـــــ کائنات مسکرا پڑے۔ فضائیں تن جائیں اور نگاہوں کے سامنے ان گنت دیئے جھلملا اُٹھیں۔ زندگی ایک نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتی، لجاتی، جھینپتی ہمارا استقبال کرے لیکن نیلگوں پردوں میں رہنے والا عشوہ طراز ہمارے ارمانوں اور آشاؤں کی کلیوں کو کھلنے نہیں دیتا ـــــ ہماری تمنائیں، ہماری تمنائیں نہیں ہیں ـــــ ہماری آرزویں ہماری آرزوئیں نہیں ہیں۔ ہماری خوشیوں کے دروازے ہم پر مسدود ہیں جن پر قدرت کے آہنی تالے لگے ہوئے ہیں۔

ہماری پاک خواہشات اور سہانے سپنوں کی تعبیریں ہماری دسترس سے باہر ہیں اس لئے اے میری محبوب! میری کنول رانی ـــــــ !! میری تمناؤں کی مرکز!!! نہ جانے کس اجنبی جذبہ کے تحت میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ

"تم بڑی سنگدل ہو !!"

ہماری جدائی کا وہ لمحہ بھی کتنا جاں گسل اور جاں کاہ تھا جب کہ تمہاری تاریک رات سی کالی کالی آنکھوں میں ننھے ننھے سے ستارے جھلملا رہے تھے۔ اور تمہارے رسیلے لبوں پر کپکپاہٹ سی تھی اور کسی نامعلوم خوف و ہراس سے تم مجھ سے جدا ہوتے وقت کپکپا رہی تھیں۔ میں نے روندھے ہوئے گلے سے کہا تھا "نازو ـــــ! کہیں ایسا نہ ہو میری آنکھیں تمہاری راہ تکتے تکتے پتھرا جائیں"۔ تم نے اپنی نرگسی آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے ننھے ننھے ستاروں کو اپنی گلابی آنچل میں چھپا لیا تھا اور بولیں

"کیا تمہیں میرا بھروسہ نہیں اشفاق؟"

اور ـــــ اور میرے جانے کے بعد تم نے چند میٹھے بول لکھ کر اپنی دانست میں یہ تصور کر لیا کہ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے کائنات کی ساری دولت سمیٹ کر میرے پہلو میں ڈال دی ہے

بڑی اچھی طرح مطالعہ کیا ہے اور جامعہ عثمانیہ کی زندگی نے مجھے بے حد حساس بنا دیا ہے جس کی وجہ زمانے کے ہاتھوں ستائی ہوئی عورتوں کی بے بسی سے زیادہ مجھے انسانی زندگی کے کسی دوسرے المیہ پہلو نے متاثر نہیں کیا۔ ویسے بقول ہارڈی ہماری یہ زندگی ہی انسانیت کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہے۔ لیکن اب اسے کیا کیجئے کہ مشرقی عورت کی پریشاں، بھیگی بھیگی سی آنکھوں کی افسردگی اور بے بسی کے آگے مجھے دنیا کے تمام مسئلے ہیچ نظر آتے ہیں۔ ہندوستانی عورت کی بے بسی کو دیکھ کر میں نے بارہا غور کیا ہے کہ یہ ہماری زندگی کا کیسا المیہ ہے کہ وہ عورت جس کی مدد کے بغیر مرد کشمکش زندگی میں ایک پل بھی ٹک نہیں سکتا ـــــ وہ عورت جو بیوی بن کر دلوں پر حکومت کرتی ہے، وہ عورت جو بہن بن کر سراپا ہمدردی ہوتی ہے، وہ عورت جو ماں بن کر ایثار و قربانی کا جیتا جاگتا نمونہ نظر آتی ہے اور دنیا کے سب سے بڑے پیغمبر صلعم نے جس کے قدموں تلے جنت بتائی ہے، اس عورت کی حیثیت مشرق میں ایک کمزور بے بس کنیز سے زیادہ نہیں؟ میں اپنی ان ذہنی الجھنوں سے

چھٹکارہ پانے کی خاطر ہی کہانیاں لکھا کرتی ہوں اور شاید انہی ذہنی الجھنوں کی وجہ سے میری ہر کہانی کی ہیروئن "مجسم بے بسی" ہے۔

اپنی کہانیوں میں مجھے سب سے زیادہ "مثلث" "التجا" اور "سنہری آنکھیں" پسند ہیں۔ کیونکہ ان تینوں کہانیوں کا تعلق ایسی ہستیوں سے ہے جو مجھے بے حد عزیز ہیں۔ "التجا" کو میں نے فرانس کے مشہور ادیب اسٹیفن زویگ کی تیکنیک پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے مجھے یہی تیکنیک زیادہ عزیز ہے کیونکہ اس میں پلاٹ وغیرہ کا خیال رکھے بغیر آزادی کے ساتھ قلم چلایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ قصہ مختصر میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اگر یہ داستانیں آپ کو پسند آئیں تو اس کے دوسرے ایڈیشن کا انتظار کیجئے اور اگر فضول سی معلوم دیں تو اپنے کسی بہت قابل کرم فرما کی خدمت میں جنہیں ہر چیز کا "پہلو" ڈھونڈ نکالنے کا مرض ہو، یہ مجموعہ بطور نذر عقیدت پیش کر دیجئے گا تاکہ اس بھی مختلف پہلو ڈھونڈ نکالنے میں ان کا کافی سے زیادہ وقت صرف ہو اور اس درمیان میں دوسرے فن کاروں کا بھی کچھ بھلا ہو جائے۔ فقط آپ کی (?)